www.Paksociety.com
شیرنی
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
انوار علیگی
www.paksociety.com
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.Paksociety.com

شیرنی

کالی حویلی کے پیچھے چھپا ہوا سنہری سورج آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا۔

یہ حویلی کنور جہاں زیب کی تھی۔ سفید رنگ کی اس حویلی کو "کالی حویلی" کیوں کہا جاتا تھا یہ کسی کو معلوم نہ تھا، بس ایک بات مشہور ہو گئی تھی غلط یا صحیح وہ سینہ بہ سینہ چلی آ رہی تھی۔ ہو سکتا ہے بظاہر سفید نظر آنے والی یہ حویلی اندر سے کالی ہو، حویلی کے ان سفید ستونوں میں جانے کتنی ظلم کی داستانیں چھپی ہوں، اس کی سفید پیشانی پر جانے کتنے کلنک لگے ہوں، ان سفید دیواروں نے سفاکی کے جانے کیا کیا مناظر دیکھے ہوں۔

ویسے جب کوئی بات مشہور ہوتی ہے تو وہ بے بنیاد نہیں ہوتی، اس کے پیچھے کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ رائی کا پہاڑ بن سکتا ہے لیکن رائی کے بغیر نہیں۔ اس سفید حویلی کو "کالی حویلی" کا نام دینے والوں نے کہیں کچھ نہ کچھ ضرور دیکھا ہو گا، اگر دیکھا نہیں ہو گا تو محسوس کیا ہو گا۔ کہتے ہیں کہ کسی برائی کو چھپایا نہیں جا سکتا، جلد یا بدیر وہ ظاہر ہو کر رہتی ہے۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دیواروں کی بھی آنکھیں ہوتی ہیں۔

ان دیواروں کے حصار میں جو کچھ ہوتا ہے، وہ جوں کا توں ریکارڈ ہوتا جاتا ہے۔ آواز بھی اور صورت بھی اور وہ حرکتیں بھی جو انسان دیواروں کو اندھا سمجھ کر کرتا ہے۔ پھر یہ پکی اور کچی دیواریں، اونچی اور نیچی دیواریں پتلی اور موٹی دیواریں حساس ذہنوں کو سب کچھ سنا اور دکھا دیتی ہیں۔

بعض مکانوں کو دیکھ کر اچانک پر اسراریت کا احساس ہوتا ہے۔ اچھے بھلے جگمگاتے مکانوں پر تاریک چادر پڑے ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ کنور جہاں زیب کی یہ حویلی بھی انہی مکانوں میں سے تھی، سفیدی کے باوجود سیاہی کا احساس ہوتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر کچھ ہو رہا ہے، اندر کچھ ہوا ہے یا اندر کچھ ہونے والا ہے۔ شاید اسی لیے اس حویلی کا نام "کالی حویلی" پڑ گیا تھا۔

حویلی کے پسِ منظر سے ابھرتا سورج اسے اس وقت "کالی حویلی" بنائے ہوئے تھا، پراسرار اور عجیب۔
کنور جہاں زیب صبح ہی اٹھنے کے عادی تھے۔ سب سے پہلے وہ اپنی گھوڑی پر بیٹھ کر ہوا خوری کے لیے نکلتے۔ گھنٹے آدھ گھنٹے کی سیر کے بعد جب وہ واپس پلٹتے تو سورج ان کی حویلی کے پیچھے سے سر ابھار رہا ہوتا۔
آج بھی جب انہوں نے اپنی چہیتی گھوڑی برق فشاں کی پیٹھ سے چھلانگ لگائی تو انہیں روز کی طرح حویلی پر اندھیرا دکھائی دیا۔ کنور جہاں زیب کو گھوڑی سے اترتے دیکھ کر ملازم تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے برق فشاں کی لگام تھام لی، پھر وہ بڑے پیار سے اسے اصطبل کی طرف لے چلا۔
کنور جہاں زیب مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے حویلی میں داخل ہوئے۔ حمام تیار تھا، وہ جدید آسائشوں سے آراستہ اس باتھ روم میں گھس گئے۔ باتھ میں نصب قدِ آدم آئینے میں اپنے سراپا کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کپڑوں سے جان چھڑائی۔ اپنے کسرتی بدن کی خوبیوں اور خامیوں کو حسبِ معمول جانچا پرکھا اور پھر ٹب میں اتر گئے۔ نہا دھو کر ہشاش بشاش ہو کر وہ باتھ روم سے برآمد ہوئے تو سامنے بڑے مؤدبانہ انداز میں چھوٹی بیگم کی خاص ملازمہ کو کھڑا پایا۔
کنور جہاں زیب نے اسے محض سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، منہ سے کچھ نہ بولے۔
"سرکار!" ملازمہ اتنا کہہ کر چپ ہوگئی، آگے بولنے کی ہمت نہ پڑی۔
"ہاں۔۔۔ بولو کیا بات ہے؟" کنور جہاں زیب نے بولنے کی اجازت دی۔
"سرکار! چھوٹی مالکن آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" ملازمہ نظریں نیچی کیے دھیرے سے بولی۔
"ٹھیک ہے، ہم آتے ہیں۔" وہ جانتے تھے کہ انہیں کیوں بلایا گیا ہے۔
یہ سن کر وہ تھوڑا سا ادب سے جھکی اور پھر الٹے قدموں نظریں جھکائے پردوں کے پیچھے گم ہوگئی۔
جہاں زیب کی دو بیویاں تھیں۔ ویسے باقاعدہ شادیاں تو انہوں نے چار کی تھیں۔ ایک ساتھ نہیں، یکے بعد

دیگرے۔ اب تک دو بیویوں کو کفن پہنا چکے تھے۔ تیسری قریب المرگ تھی، کینسر کی مریض۔ گو ان کی عمر زیادہ نہ تھی، یہی ستائیس اٹھائیس سال رہی ہو گی لیکن سینے کے کینسر نے انہیں سانپ بن کر ڈس لیا تھا۔ اب وہ اس کینسر کے زہر کو اپنے جسم میں پھیلتا اور بڑھتا محسوس کر رہی تھیں۔ چوتھی یعنی چھوٹی بیگم ہی اب سارے سیاہ و سفید کی مالک تھیں۔
چار شادیاں کرنے کے باوجود وہ جاگیر کے وارث سے محروم تھے۔ بس پہلی بیوی سے ایک لڑکی تھی، جو لاہور میں زیرِ تعلیم تھی۔ بعض لوگ اللہ کی بنائی ہوئی زمین پر فرعون بن جاتے ہیں، اکڑ کر چلتے ہیں۔ خود کو بہت کچھ سامنے والے کو گھاس کوڑا سمجھتے ہیں۔ وہ بنانے والے کو بھول کر خود بنانے والے بن جاتے ہیں۔ لیکن اللہ پھر اللہ ہے، وہ بہت کچھ دے کر بہت کچھ چھین سکتا ہے۔ اپنے ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔ یہ بتا دیتا ہے کہ بندہ کتنا مجبور ہے۔ اب کوئی سمجھے یا نہ سمجھے یہ اس کی مرضی۔ آپ کروڑ پتی ہیں، آپ کی ڈائننگ ٹیبل پر خورد و نوش کی ہزارہا اشیاء سجی ہیں لیکن آپ کیا کھا رہے ہیں؟ ڈبل روٹی کا ایک سلائس۔ جس کی قیمت پچیس پیسے بھی نہیں۔ کیا پی رہے ہیں بغیر شکر کی چائے کہ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اب آپ لوگوں کو محض کھاتا ہوا دیکھ سکتے ہیں، خود کچھ نہیں کھا سکتے۔ آپ کی ڈائننگ ٹیبل پر ہزار نعمتیں موجود پر آپ کھانے سے مجبور۔ یہ ہے قدرت کا کھیل، آپ مانیں یا نہ مانیں۔
کنور جہاں زیب کا مسئلہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ اللہ نے انہیں اتنی زمین بخشی تھی کہ اگر کوئی گھڑ سوار صبح تڑکے زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑے پر سوار ہو کر پوری رفتار سے شام تک پہنچنے کی کوشش کرے تو نہ پہنچ پائے۔ زمین کے علاوہ ان کی کئی ملیں تھیں، پھر مختلف کاروبار میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ گویا اللہ نے دولت انہیں جی کھول کر بخش دی تھی لیکن دولت کے وارث سے انہیں محروم کر دیا تھا۔ یہ ہے قدرت آپ جانیں یا نہ جانیں۔

ناشتے کی میز پر چھوٹی بیگم کنور جہاں زیب کی منتظر تھیں۔ جیسے ہی وہ کمرے میں داخل ہوئے چھوٹی بیگم اپنے مجازی خدا کے احترام میں

کھڑی ہو گئیں اپنی خوبصورت مسکراہٹ سے انہیں خوش آمدید کہا۔ ملازمہ نے آگے بڑھ کر کرسی پیچھے کھسکائی، انہیں بیٹھنے میں مدد دی، خوشبو میں بسا نیپکن ان کی گود میں پھیلایا اور چند قدم پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔ چھوٹی بیگم نے اسے آنکھ سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ بے آواز کمرے سے نکل گئیں۔

آج شاپنگ کا ارادہ ہے؟ کنور جہاں زیب نے اپنے شیریں ہونٹوں سے انہیں وش کیا اور اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"آج شاپنگ کا ارادہ ہے؟" کنور جہاں زیب نے اپنی چوتھی پر کشش بیوی کو مسکرا کر دیکھا۔

"آپ نے کیسے جانا؟" چھوٹی بیگم حیران رہ گئیں۔

"بھئی آپ ہماری بیگم ہیں، ہم آپ کے انداز نہیں سمجھیں گے تو اور کون سمجھے گا۔"

"لیکن میں تو روز جیسی ہوں۔"

"یعنی گلاب جیسی۔"

"نہیں روزانہ جیسی۔ آپ بھی خوب بات سے بات نکالتے ہیں۔" چھوٹی بیگم نے انہیں بڑے پیار سے دیکھا۔

کنور جہاں زیب اس وقت پینتالیس کے پیٹے میں تھے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹے لگتے تھے۔ صحت اچھی تھی رنگ وروپ چمکتا ہوا تھا، سرخ سفید رنگت، گھنے سیاہ بال جن میں ایک بال بھی سفید نہ تھا۔ وہ درمیان سے مانگ نکالتے تھے۔ آنکھیں بڑی بڑی اور نیلی، یہ رنگت انہیں اپنے باپ سے ورثے میں ملی تھی اور یہ وراثت انہوں نے اپنی بیٹی کو منتقل کر دی تھی۔ انہوں نے دنیا دیکھی اور اس دنیا میں انہوں عورتیں زیادہ دیکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ عورتوں کی نفسیات سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ ہو

سکتا ہے یہ بات ٹھیک ہو۔ جس مرد کا اوڑھنا بچھونا عورتیں ہوں، وہ اگر ان کی نفسیات سے واقفیت کا دعوٰی کرے تو مان لینے میں کیا ہرج ہے۔ چھوٹی بیگم بڑی خوشامد پسند واقع ہوئی تھیں۔ جب انہیں اپنی کوئی بات منوانا ہوتی تو وہ کنور جہاں زیب کی اسمارٹنیس کی تعریف کرتیں یا پھر اس طرح وش کرتیں جس طرح آج انہوں نے کیا تھا۔ اور جب وہ ایسا کرتیں تو کنور صاحب فوراً تاڑ جاتے کہ آج کچھ دال میں کالا ہے۔

"جی بیگم صاحب پھر فرمائیں! کیا ارادہ ہے؟" کنور جہاں زیب نے چائے کی پیالی سے اٹھتی ہوئی بھاپ کو گھورتے ہوئے کہا۔

"آپ یہ تو بتائیں کہ آپ نے کیسے جانا؟" چھوٹی بیگم نے حیرت ظاہر کی۔

"چھوڑیں اس بات کو۔ آپ مطلب پر آئیں۔" کنور جہاں زیب نے لہجے میں ذرا سی سنجیدگی پیدا کرلی۔ تب چھوٹی بیگم فوراً سنبھل گئیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بحث سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، بات بگڑ جائے گی۔ تب وہ فوراً مطلب پر آ گئیں۔

"وہ جیولر کا فون آیا تھا۔" چھوٹی بیگم نے لہجے میں شہد بھرتے ہوئے کہا۔ "اس کے پاس کچھ نئے سیٹ آئے ہیں، پوچھ رہا تھا کہ بھجوا دوں یا خود آکر دیکھیں گی۔"

"آپ نے جواب دیا ہوگا کہ بھیجو نہیں میں خود آؤں گی۔" کنور جہاں زیب کسی نجومی کی طرح بولے۔

"کیوں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟"

"کہیں مجھ سے غلطی تو نہیں ہو گئی؟" چھوٹی بیگم کچھ خوفزدہ سی ہو گئیں۔

"نہیں غلطی تو نہیں ہوئی۔ اگر وہ جیولر سیٹ یہاں لے کر آجاتا تو کیا مزہ آتا۔ شاپنگ کا اپنا ایک مزہ ہوتا ہے، پھر وہ سارے سیٹ تو یہاں نہیں لا سکتا نا۔ آپ سوچتی رہتیں کہ کہیں اچھے سیٹ دکان پر نہ چھوڑ آیا ہو، شہر جائیں گے تو دو چار جیولروں کی دکان پر ضرور پھیرا ماریں گی۔ اس طرح شاپنگ میں مزہ آئے گا۔" کنور جہاں

زیب چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔

"کنور صاحب آپ بہت گریٹ ہیں، تو پھر میں جاؤں۔"

"ہاں جائیں۔" انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"کون سی گاڑی لے جاؤں اور کس کس کو ساتھ لے جاؤں۔" چھوٹی بیگم نے پوچھا۔

جواب میں کنور جہاں نے ایک ایک بات تفصیل سے بتادی۔ کون سی گاڑی جائے گی، کون کون ساتھ جائے گا، کب روانگی ہوگی اور کب واپسی سارا شیڈول طے کر کے انہوں نے اسٹڈی کا رخ کیا۔

اسٹڈی میں شیشے کی ایک چھوٹی میز پر آج کے تمام اخبارات قرینے سے رکھے تھے۔ وہ ایک ایک اخبار ترتیب سے دیکھتے گئے۔ یہ ترتیب ان کی پسند کے مطابق تھی۔ اخبارات وہ کبھی تفصیل سے نہ پڑھتے تھے لیکن دیکھتے وہ اخبار کا ہر صفحہ تھے۔ اشتہارات بغور خاص دیکھتے۔ کچھ اخباروں کے اداریے پڑھتے تو کچھ اخباروں کی خبروں پر نظر ڈالتے۔ اس طرح اخبارات کے مطالعے میں گھنٹا ڈیڑھ گھنٹا صرف ہو جاتا۔

ابھی وہ اخبارات کے مطالعے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ یعقوب اسٹڈی میں داخل ہوا اور بغیر بولے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں۔" کنور جہاں زیب نے نظر اٹھائی۔ "کیا بات ہے؟"

"سرکار! رانی آگئی ہے۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اچھا۔" رانی کا نام سن کر ان کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ "ٹھیک ہے۔ تم چلو، میں آتا ہوں۔"

"جی بہتر، سرکار۔" یعقوب نے الٹے قدموں لوٹتے ہوئے کہا۔ یعقوب ان کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ وہ اس پر بڑا اعتماد کرتے تھے اور اس اعتماد کی ڈوریاں بہت دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یعقوب جہاں ایک وفادار اور بھروسے کا ملازم تھا، وہاں اس میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ کنور صاحب اسے جو دکھاتے وہ دیکھتا، جو سناتے، وہ

سنتا، اگر اسے کچھ زیادہ دیکھنا اور سننا پڑ جاتا تو وہ پتھر کا بن جاتا۔

جب وہ اس مخصوص کمرے میں داخل ہوئے، جہاں رانی کو آنا تھا تو انہوں نے دیکھا کہ وہاں یعقوب ہاتھ میں ہنٹر لیے کھڑا تھا۔ اس مخصوص کمرے میں صرف ایک اونچی سی کرسی پڑی تھی اور اس کرسی کے قریب مضبوط تپائیوں پر بڑے بڑے تھال رکھے تھے جو ریشمی کپڑوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ یہ اونچی کرسی بالکل کمرے کے وسط میں رکھی تھی، نیچے دبیز قالین تھا۔

کنور جہاں زیب نے یعقوب کے ہاتھ سے ہنٹر لے لیا اور مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے کرسی پر براجمان ہو گئے۔

"بلاؤ اسے۔" انہوں نے حکم دیا۔

حکم سن کر یعقوب کمرے کے بڑے دروازے کی طرف بڑھا یہ دروازہ پیچھے باغ میں کھلتا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک پنجرہ گاڑی دکھائی دی۔ یعقوب کے اشارہ کرنے پر اس گاڑی کو آگے لایا گیا۔ گاڑی سے دروازے تک وہ چوڑے تختے پر رکھے گئے اور پھر لوہے کی سلاخوں والا جنگلا اوپر کھینچ لیا گیا۔

جنگلا کھلتے ہی رانی تیر کی طرح باہر نکلی اور تختوں پر چلتی ہوئی کمرے میں آگئی۔ کنور جہاں زیب کو دیکھ کر وہ ہلکا سا غرائی اور پھر ان کے قدموں میں یوں بیٹھ گئی جیسے کوئی پالتو بلی ہو۔

رانی پالتو بلی نہ تھی، شیرنی تھی شیرنی۔

کنور جہاں زیب نے اپنی چہیتی رانی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ "کہو رانی کیسی ہو؟"

رانی جواب میں ہلکا سا غرائی جیسے کہا ہو ٹھیک ہوں کنور صاحب۔ تب کنور جہاں زیب نے تھال کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یعقوب نے تھال سے ریشمی کپڑا ہٹایا۔ تھال میں گائے کا تازہ گوشت تھا۔ یعقوب نے گوشت کا ایک پارچہ اٹھا کر کنور صاحب کے ہاتھ پر رکھا۔ کنور صاحب نے گوشت کے اس ٹکڑے کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر ہوا

میں لہرایا۔رانی اپنے پچھلے دو پاؤں پر کھڑی ہوگئی اور کنور صاحب نے جیسے ہی گوشت کا ٹکڑا چھوڑا، رانی نے اسے فوراً لپک لیا۔اس طرح ایک ایک کر کے سارے تھال خالی ہوگئے۔

کنور جہاں زیب کا یہ روز کا مشغلہ تھا۔رانی کو انہوں نے بچپن سے اسی طرح کھلایا تھا۔وہ اب ان کے سامنے شیرنی نہ رہی تھی، بلی ہوگئی تھی۔وہ ان سے اس قدر مانوس ہوگئی تھی کہ ایک دن کسی ضرور کام سے کنور صاحب کو صبح ہی صبح شہر جانا پڑا تو وہ یعقوب کو ہدایت کر گئے کہ وہ رانی کو گوشت کھلا دے اور جب یعقوب نے کنور جہاں زیب کی طرح کرسی پر بیٹھ کر گوشت کا ٹکڑا ہوا میں لہرا کر نیچے چھوڑا تو وہ سیدھا قالین پر گرا۔

رانی نے اسے لپکنے کی بالکل کوشش نہ کی۔یعقوب نے دوبارہ وہی عمل دوہرایا کہ شاید غلطی سے ایسا ہوگیا ہے لیکن دوبارہ بھی رانی نے گوشت کا ٹکڑا کیچ کرنے کی کوشش نہ کی۔تب یعقوب نے گوشت کا تھال اس کے سامنے رکھ دیا مگر رانی نے اسے سونگھا بھی نہیں۔یعقوب نے ساری ترکیبیں آزما ڈالیں پر رانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔زبردستی گوشت کھلانے کی کوششوں پر رانی کو غصہ آگیا۔وہ یعقوب کو دیکھ کر غرانے لگی۔اسے غصے میں دیکھ کر یعقوب کے پسینے چھوٹ گئے۔ہنٹر پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ رانی اگر واقعی غصے میں آگئی اور اس نے حملہ کر دیا تو اس کے ایک پنجے سے ہی اس کی کھال ادھڑ جائے گی۔

موت کو اتنے نزدیک دیکھ کر اس کے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی۔اس نے بڑی ہوشیاری اور آہستگی سے اسے پنجرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔یعقوب جیسے جیسے اسے پنجرے کی طرف جانے کا اشارہ کرتا ویسے ویسے اس کی غراہٹ میں اضافہ ہو جاتا۔یعقوب دھیرے دھیرے اب کرسی کی اوٹ میں چلا گیا تھا لیکن اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ کرسی اسے بچا نہ سکے گی۔کرسی نے کب کسی کو بچایا ہے، کرسی کہاں اتنی مضبوط ہوتی ہے۔

رانی اس کے ہاتھ سے گوشت نہیں کھا رہی تھی، واپس اپنے پنجرے میں بھی نہیں جا رہی تھی، اب سوائے

اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ یہاں سے راہِ فرار اختیار کرے۔تب وہ غیر محفوظ طریقے پر اس دروازے کی طرف بڑھنے لگا جو حویلی میں کھلتا تھا۔وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹ رہا تھا، نظریں رانی پر جمی تھیں۔رانی اب بیٹھ گئی تھی اور بڑے غور سے یعقوب کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

دروازے کو اپنے پیچھے محسوس کر کے اس نے ایک ہاتھ سے اس کا ہینڈل ٹٹولا اور چشم زدن میں دروازے سے باہر ہوگیا۔پھر اس نے تیزی سے بھاگ کر پنجرہ گاڑی کے محافظ ہلا کو خان کو ہوشیار کر دیا اور ہدایت کر دی کہ جیسے ہی رانی گاڑی کی طرف آئے تو فوراً جنگلا گرا دیا جائے۔اس کے علاوہ اس نے حویلی کے دوسرے محافظوں کو بھی چوکس کر دیا تھا اور خود بھی اپنی ڈبل بیرل بندوق میں ایل جی کے دو کارتوس ڈال کر باغ میں ٹہلنے لگا۔لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔رانی پنجرہ گاڑی کی طرف نہ آئی، حتّٰی کہ دہاڑنے یا غرانے تک کی آواز نہ سنائی دی۔

کمرے میں مکمل سناٹا تھا، جیسے رانی پاؤں پر سر رکھے سو گئی ہو اور واقعی وہ سو گئی تھی۔جب دوپہر کو کنور جہاں زیب شہر سے واپس آئے تو گاڑی سے اترتے ہی انہیں یعقوب کی شکل دکھائی دی۔اس کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی اور ایک ہاتھ میں بندوق جس کی نال زمین کی طرف تھی وہ نظریں نیچی کیے شرمندہ سا کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟'' کنور صاحب کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی لیکن انہوں نے اپنے لہجے کو برہم نہ ہونے دیا۔

''مالک! رانی ابھی تک کمرے میں ہے۔'' یعقوب نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیا مطلب؟'' کنور صاحب کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''مالک اس نے گوشت نہیں کھایا اور نہ ہی وہ پنجرے میں گئی۔وہ کمرے میں ہے۔مالک میں نے کوشش کی وہ گوشت کھا لے یا پھر پنجرے میں چلی جائے مگر ایسا نہ ہو سکا۔رانی غصے میں آنے لگی تو میں نے راہِ فرار اختیار

اس دن جب کنور صاحب رانی کو گوشت کھلا کر نکلے تو انہوں نے اپنی تیسری بیگم شائستہ جبیں کو اپنے کمرے کے سامنے ٹہلتے ہوئے پایا۔ کنور صاحب رانی کو گوشت کھلانے کے لیے صبح کو روز آتے تھے۔ وہ رانی تک پہنچنے کے لیے روز شائستہ بیگم کے کمرے کے آگے سے گزرتے تھے لیکن اتفاق سے ہی وہ اپنی اس کینسر زدہ بیوی کے کمرے کا رخ کرتے۔ آج جب انہوں نے شائستہ بیگم کو اپنے کمرے کے آگے راہداری میں ٹہلتے پایا تو وہ ان کے پاس رک گئے۔ مقصد بظاہر ان کی خیریت معلوم کرنا تھا لیکن رانی کی ان سے محبت کے اظہار کو چٹخارے لے کر سنانا تھا۔ "شائستہ بیگم کیسی ہیں آپ؟" کنور صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"ابھی ہم زندہ ہیں کنور صاحب۔" شائستہ بیگم نے اپنے لہجے کی تلخی کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"اللہ آپ کو ہمیشہ زندہ رکھے۔ ایسی مایوس کی بات کیوں کرتی ہیں آپ۔" کنور صاحب نے بات کی تہ تک جانے سے گریز کیا۔

"اس وقت آپ کا گزر ادھر سے کیسے ہوا؟" شائستہ بیگم نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے رک گئیں اور کنور صاحب کو بغور دیکھتے ہوئے گویا ہوئیں۔ "اندر آیئے گا۔" کنور صاحب کو اس بجھتی شمع سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بس وہ مروتاً کمرے میں داخل ہو گئے۔ "بولے چلیے کچھ دیر بیٹھ جاتا ہوں۔"

"جی، شکریہ۔" شائستہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ یہ وہی کنور صاحب تھے، جنہیں کبھی انہیں دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔

شائستہ بیگم نے اس گھڑی کو کوسا جب وہ اپنی فلم کی شوٹنگ کے لیے کنور صاحب کے علاقے میں آگئی تھی۔ فلم کے پروڈیوسر خالق انصاری کی کنور صاحب سے دوستی تھی، اسی لیے انہوں نے اس علاقے کو شوٹنگ کے لیے منتخب کیا تھا۔ کنور صاحب نے اس فلم کے یونٹ کی بڑی پذیرائی کی، اپنی حویلی میں ٹھہرایا اور جن جن

چیزوں کی فلم کی شوٹنگ کے لیے ضرورت تھی، وہ سب مہیا کیں۔

جب کھانے ہر پہلی ملاقات شائستہ بیگم سے ہوئی تو کنور صاحب اس سنجیدہ اور شائستہ ہیروئن کو دل ہار بیٹھے۔ شائستہ بیگم ان دنوں ستارہ خان کے نام سے مشہور تھیں۔ خوبصورت تو خیر وہ تھیں ہی، اداکار بھی غضب کی تھیں۔ ادھر کنور صاحب کی شخصیت اور شان و شوکت دیکھ کر شائستہ بیگم بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ اس فلم کا یونٹ دس دن حویلی میں ٹھہرا۔ ان دس دنوں میں محبت کی سلگتی چنگاری شعلہ جوالہ بن گئی۔ کنور صاحب کے لب پر بس ایک ہی نام تھا۔ وہ ستارہ کو اپنی جبیں پر سجالینا چاہتے تھے۔ خود ستارہ کا بھی یہی حال تھا، وہ ستارہ خان سے شائستہ جبیں بن جانا چاہتی تھیں۔

تب اس فلم کا ہدایت کار اور فلم ساز خالق انصاری درمیان میں کودا۔ ولن بن کر نہیں بلکہ دوست بن کر اس نے کنور جہاں زیب کو ساری اونچ نیچ سمجھانے کی کوشش کی۔ کنور صاحب کوئی بچے تو نہ تھے، وہ ان اداکاراؤں کی نس نس سے واقف تھے۔ یہ کیسی ہوتی ہیں؟ کتنے ہاتھوں سے گزر کر پتھر سے ہیرا بنتی ہیں؟ انہیں سب معلوم تھا۔ لیکن ستارہ خان کچھ اس طرح ان کی آنکھوں میں سمائی تھی کہ کوئی اسے نکال نہیں سکتا تھا۔ ویسے بھی کنور صاحب خاصے ضدی واقع ہوئے تھے۔ کسی پسند کی چیز کو چھوڑ دینا انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ یوں ستارہ خان کو انہوں نے شائستہ جبیں بنا دیا۔ ایک فلمی ہیروئن کو انہوں نے بیگم کنور جہاں زیب بنا کر ہی دم لیا اور اس طرح فلم کے یونٹ کو ستارہ خان کے بغیر ہی واپس جانا پڑا۔ خالق انصاری کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا کیونکہ اس شوٹنگ کے بعد اس فلم میں ستارہ خان کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ پیچ ورک میں دو چار شاٹس نکلے بھی تو اس نے ڈپلیکیٹ سے کام چلالیا۔

کنور جہاں زیب نکاح کے بعد شائستہ بیگم کو دنیا دکھانے لے گئے۔ دو ڈھائی مہینے کے بعد جب وہ واپس آئے تو ان فلمسازوں نے سکھ کا سانس لیا جن کی فلموں میں وہ بطور ہیروئن کام کر رہی تھی اور اس کا خاصا کام شوٹ

ہو چکا تھا۔ ان تمام فلمسازوں نے خالق انصاری کو پکڑا کہ وہ چل کر ستارہ سے بات کرائے کیونکہ وہ مصیبت اسی کی نازل کردہ تھی۔ مجبور ہو کر خالق انصاری کنور جہاں زیب کے پاس پہنچا اور انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ خالق انصاری کی ساری بات سن کر مسکرائے اور بولے۔ "انصاری تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں اپنے بھائیوں کو نقصان سے بچانا چاہتا ہوں۔"

"یعنی تم یہ چاہتے ہو کہ میں شائستہ بیگم کو فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دوں؟"

"فلموں میں کام کرنے کی اجازت نہیں، صرف ان فلموں میں جن کی شوٹنگ ہو چکی ہے اور وہ محض شائستہ بیگم کے کام کی وجہ سے ڈبوں میں بند ہیں۔"

"ہاں میرا ابھی یہی مطلب تھا۔" کنور صاحب نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں انکار کر دوں تو؟"

"تو بہت برا ہوگا۔ فلم انڈسٹری کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔" خالق انصاری نے مایوسی سے کہا۔ "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تم سمجھ دار آدمی ہو۔" "میں سمجھ دار آدمی ہوں، تبھی تو ایسا کر رہا ہوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ وہ میری اجازت کے بغیر فلموں میں کام مکمل کرانے چلی جائیں گی؟"

"نہیں، یہ خیال تو نہیں ہے میرا۔" خالق انصاری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "شاید ہمارا موقف وہ زیادہ بہتر طور پر تمہیں سمجھا سکیں۔"

"چلو ٹھیک ہے، میں انہیں بلوا لیتا ہوں۔" کنور جہاں زیب نے سامنے کھڑے ایک ملازم سے شائستہ بیگم کو بلانے کا اشارہ کیا۔

"اگر اجازت ہو تو باہر بیٹھے دوسرے فلمسازوں کو بھی اندر بلوالوں تاکہ جو بات ہو ان کے سامنے ہو، انہیں تسلی رہے۔" خالق انصاری نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں انصاری۔ میں یہاں کسی کی تسلی کے لیے نہیں بیٹھا ہوں۔ کنور صاحب کی پیشانی تھکن آلود ہو گئی۔ تم

میرے دوست ہو اس لیے یہ ان نے اس موضوع پر بات کرنا گوارا کرلی ہے اور تمہاری خواہش پر شائستہ بیگم کو بھی بلوایا ہے۔ اگر تم میرے دوست نہ ہوتے تو اس وقت تم بھی وہیں بیٹھے ہوتے اور میرا کوئی ملازم تم سے بات کر رہا ہوتا، لہٰذا تم بیٹھ جاؤ وہ جہاں بیٹھے بیٹھے ہیں انہیں بیٹھا رہنے دو۔ وہ کنور جہانزیب کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز ہے۔"

"بے شک بے شک۔" خالق انصاری ان کا موڈ بدلتا دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ وہ گھبرا کر بولا۔ "کنور جہاں زیب پلیز ناراض نہ ہوں۔"

"انصاری میرے لیے یہ بہت آسان ہے کہ ایک بلینک چیک تمہارے حوالے کر دوں تاکہ تم سب کا نقصان پورا کرو اور وہ ستارہ خان کو بھول جائیں۔ لیکن میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں فنکار لوگوں کی بہت عزت کرتا ہوں، شائستہ بیگم بھی ایک فنکارہ ہیں۔ لہٰذا میں ان کی مرضی ضرور معلوم کرلینا چاہتا ہوں اور یہ بات میں ابھی تمہارے سامنے کروں گا۔ پھر جو بات طے ہو جائے وہ تم اپنے بھائیوں کو بتا دینا۔ ٹھیک ہے؟" کنور جہاں زیب نے آہستہ آہستہ اپنے غصے پر قابو پالیا۔

"ٹھیک ہے۔" خالق انصاری انہیں نارمل ہوتے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اتنے میں شائستہ بیگم مسکراتی ہوئی اس خاص ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں، جو صرف خاص لوگوں کے لیے بنایا گیا تھا۔

خالق انصاری شائستہ بیگم کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور بڑے ادب سے بولا۔ "میڈم آپ کیسی ہیں؟"

"بہت اچھی۔ انصاری صاحب، آپ اپنا حال سنائیں۔"

شائستہ بیگم نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"میڈم لکھ کر سناؤں یا زبانی؟" خالق انصاری نے شگفتگی سے کہا۔

"یہ اپنی برادری دوسرے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہے۔ وہ سب آپ کو لینے آئے ہیں۔"

شائستہ بیگم کی شادی کے وقت ان کا ستارہ عروج پر تھا۔ کوئی بیس پچیس فلمیں ان کے ہاتھ میں تھیں کچھ۔ فلمیں تو ایسی تھیں، جن کے ابھی معاہدے ہی ہوئے تھے۔ لہٰذا ان فلموں کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ جو رقم پیشگی لی گئی تھی، وہ واپس ہو سکتی تھی۔ کچھ فلمیں ایسی تھیں جن میں ستارہ خان کا تھوڑا بہت کام قلمبند ہوا تھا، ان کا بھی کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ فلمساز ستارہ کو کٹ کر کے دوسری ہیروئن کا انتخاب کر سکتے تھے۔ مسئلہ صرف ان فلموں کا تھا جو تقریباً مکمل تھیں اور تھوڑا بہت کام ستارہ خان کا رہ گیا تھا۔

بہرحال طے یہ ہوا کہ جن فلموں میں ستارہ یعنی شائستہ بیگم کا کام ناگریز ہے، ان تمام فلمسازوں کو دو مہینے کا نوٹس دے دیا جائے کہ وہ ان دو مہینوں میں اپنا کام قلم بند کرالیں اور باقی لوگوں کو ان کی رقم واپس کر دی جائے۔

خالق انصاری بھی یہی چاہتا تھا۔ وہ کنور صاحب کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوا۔ ویسے اسے امید نہ تھی کہ کنور صاحب شائستہ بیگم کو فلمیں مکمل کروانے کی اجازت دے دیں گے۔

کنور جہاں زیب شائستہ بیگم کو پاکر بہت خوش تھے۔ دو تین سال اسی طرح ہنستے مسکراتے گزر گئے۔ پھر دھیرے دھیرے ان کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ کہاں تو یہ تھا کہ انہیں دیکھے بغیر چین نہ آتا تھا۔ پھر یہ ہونے لگا کہ وہ کئی کئی دن ان کے بغیر گزار دیتے۔ ان کی دلچسپی کم ہوتے دیکھ کر شائستہ بیگم ذہنی الجھاؤ میں مبتلا ہو گئیں۔ وہ ان کے مزاج سے واقف تھیں، لہٰذا زبان پر حرفِ شکایت لانا فضول تھا۔ وہ کنور صاحب کو اپنے سے دور ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ تڑپتی اور سسکتی رہیں۔ اس محل نما حویلی میں رہیتی عفریت بن کر انہیں ڈراتی تھیں لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ ان تنہائیوں کا کوئی مداوا نہ تھا۔ انہیں ایسا محسوس ہونے لگا جیسے حویلی کی یہ اونچی دیواریں بالآخر ان کا مدفن بن جائیں گی۔ روشنیوں کی چکاچوند میں رہنے والی اداکارہ اب خود کو تاریکیوں میں گم ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس حویلی میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے وہ اپنا حالِ دل کہہ کر بوجھ ہلکا

کرلیتی۔ وہ باہر کی دنیا سے کٹ کر رہ گئی تھی، اسے تو اندر کی دنیا کا حال بھی معلوم نہ تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ کنور جہاں زیب اپنے شب و روز کہاں گزارتے ہیں۔ وہ حویلی کے کس گوشے میں ہوتے ہیں۔ یہ سب جاننے کی اسے اجازت نہ تھی۔ ملازموں کے لبوں پر مہر لگی تھی، وہ کچھ نہ بولتے تھے۔ بس اب اس حویلی کی دیواریں تھیں اور وہ تھی۔ تب ایک دن شائستہ بیگم کے سینے میں بڑی شدت کا درد اٹھا۔ کنور جہاں زیب کو مطلع کیا گیا۔ ڈاکٹروں کو فون کیا گیا، پھر ڈاکٹروں کی ہدایت پر انہیں ہسپتال منتقل کیا گیا۔ دو تین دن وہاں مختلف ٹیسٹ ہوئے اور ڈاکٹروں نے وہ روح فرسا خبر سنائی کہ آپ کی بیگم سینے کے کینسر میں مبتلا ہیں اور یہ کینسر اتنا پھیل چکا ہے کہ وہ مشکل سے پانچ چھ ماہ زندہ رہ سکیں گی۔

کنور جہاں زیب نے اس دل دہلانے والی خبر کو بڑے اطمینان سے سنا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، یہ ان کی شخصیت کا عجیب روپ تھا۔ وہ پگھلتے تو موم ہو جاتے اور سخت ہوتے تو پتھر ہو جاتے، بے حس اور بے جان۔ اور یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ وہ کس بات پر موم ہوں گے اور کس بات پر پتھر۔ ویسے بھی اب انہیں شائستہ بیگم سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی، وہ مرتیں یا زندہ رہتیں ان کے لیے برابر تھا۔

اب ان کی نگاہوں کا مرکز ایک کالج گرل تھی جو ان کی بیٹی سعدیہ کی دوست تھی۔ سعدیہ کو اگر معلوم ہوتا کہ وہ اس کی دوست کوثر کو مرکزِ نگاہ بنالیں گے تو وہ ہرگز ان سے نہ ملواتی۔ کوثر ایک متوسط گھرانے کی لڑکی تھی، اسے سعدیہ کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بڑا رشک آتا تھا۔ وہ اکثر سعدیہ سے کہا کرتی کہ کاش میں بھی کسی جاگیردار کی بیٹی ہوتی تو تمہاری طرح ہوسٹل کے بجائے اس شاندار کوٹھی میں رہتی، آگے پیچھے نوکر گھومتے، گاڑی سیر کرنے کو ملتی۔ ہائے سعدیہ تم کتنی خوش نصیب ہو۔ سعدیہ اس کی باتیں سن کر مسکرا دیتی۔ سعدیہ اس کے مقابلے میں بڑی سادہ مزاج لڑکی تھی۔ وہ عام لڑکیوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتی تھی لیکن کنور جہاں زیب کو اپنی توہین منظور نہ تھی۔ آخر ان کا کوئی اسٹیٹس تھا۔ پھر سعدیہ ان کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ کس

طرح برداشت کرتے کہ سعدیہ عام لڑکیوں کی طرح ہوسٹل میں رہے۔

کنور جہاں زیب مہینے میں ایک دو بار ضرور لاہور کا چکر لگا لیتے تھے۔ وہ لاہور آتے تو کسی اور چکر میں تھے لیکن سعدیہ سے یہی کہتے کہ وہ اس سے ملنے آئے ہیں۔ سعدیہ باپ کی اس محبت اس توجہ پر ان کی بڑی ممنون ہوتی۔ ایک دن وہ اسی طرح آئے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اس دن کوثر بھی موجود تھی۔ شام کو ان دونوں کا شاپنگ کا ارادہ تھا۔ کوثر بڑی بن ٹھن کر آئی تھی، ویسے بھی وہ خاصی پرکشش لڑکی تھی۔ جو بھی اسے ایک نظر دیکھتا، دیکھتا رہ جاتا۔ اس کی جاذبیت اس کے چہرے سے زیادہ اس کے جسم میں تھی۔ کنور صاحب کو دیکھ کر سعدیہ بہت خوش ہوئی۔ اس مرتبہ وہ پورے ایک ماہ کے بعد آئے تھے۔ سعدیہ بھاگ کر اپنے باپ کے گلے لگ گئی اور شکایت آمیز لہجے میں بولی۔ "باباجان پورے ایک ماہ بعد آئے ہیں آپ۔" ابھی کنور صاحب کوئی جواب نہ دے پائے تھے کہ کمرے میں کوثر داخل ہوئی۔ "کون آیا ہے سعدیہ؟"

"آؤ۔ آؤ۔ کوثر! میرے باباجان سے ملو۔" سعدیہ نے اسے قریب کرتے ہوئے کہا۔ "اور باباجان یہ ہے کوثر میری کلاس فیلو بھی ہے اور دوست بھی۔"

کوثر نے بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔

کنور جہاں زیب اسے دیکھ کر اس کے سلام کا جواب دینا بھی بھول گئے۔ بس اسے دیکھتے رہ گئے، بالکل اسی طرح جیسے شائستہ بیگم کو پہلی ملاقات پر دیکھتے رہ گئے تھے۔

"باباجان!" کوثر نے سلام کیا، سعدیہ نے محویت توڑنے کی کوشش کی لیکن یہ ایسی محویت نہ تھی جو ٹوٹ جاتی۔ اس سلام کے جواب میں وہ پیغام دینا چاہتے تھے اور جو کام کنور صاحب کرنا چاہتے تھے وہ کر گزرے تھے۔ انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا، وہ راہ میں حائل ہر دیوار کو گرانے کے اہل تھے۔

سعدیہ کو کچھ اندازہ ہوا کہ کوثر کو دیکھ کر کنور صاحب پر کیا بیت گئی ہے۔ وہ اس مرتبہ خلافِ توقع چار پانچ دن

رہے۔ جب کہ اس سے پہلے وہ ایکد ودن سے زیادہ کبھی نہ ٹھہرتے تھے۔ ایک خلافِ توقع بات یہ ہوئی کہ کوثر بھی اس دن کے بعد سعدیہ سے ملنے گھر نہ آئی۔ بلکہ وہ کالج سے بھی غائب ہوگئی۔ وہ کوثر کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جانا چاہتی تھی لیکن کنور صاحب کے جانے کے بعد کوثر کے گھر پہنچی تو اسے ایک خوشگوار صدمے سے دوچار ہونا پڑا۔ وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ کوثر کی شادی ہوگئی ہے۔

"بیٹا! ہم تم کو ضرور بلاتے لیکن کوثر نے ہماری ایک نہ سنی۔ اسے محلوں میں رہنے کا بڑا شوق تھا، قسمت کی بات کہ اس کا یہ خواب پورا ہوگیا۔ وہ محلوں میں رہنے چلی گئی، بڑی رازداری اور خاموشی سے اور ساتھ ہی ہماری زبانیں بند کر گئی۔ ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے، کچھ بتانا بھی چاہیں تو بتا نہیں سکتے۔ اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ دولت کی چکاچوند نے اسے کیا سے کیا بنادیا۔ کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ بس بیٹی تم اسے معاف کردو اور اسے بھول جاؤ، اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" اتنا کہہ کر کوثر کی ماں رونے لگیں۔

"کوئی بات نہیں، خالہ جان! اس نے شادی میں نہ بلایا نہ سہی، آپ غم نہ کریں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔" سعدیہ اتنا کہہ کر پلٹی اور بوجھل قدموں سے گھر سے نکل آئی۔

کوثر کی اس بے رخی نے اسے بہت دُکھی کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ کوثر کا اگر کسی سے افیئر تھا تو اس نے اس سے چھپایا کیوں؟ وہ کیسی دوست تھی اس کی۔

سعدیہ نے اس بے وفائی کو اپنی توہین سمجھا اور اتنا صدمہ لیا کہ وہ دو دن تک کالج نہ جاسکی۔ اسے بخار آگیا۔ پھر اس نے اس واقعے کو ڈراؤنا خواب سمجھ کر قبول کر لیا اور طے کر لیا کہ آئندہ وہ کسی کو اپنا دوست نہ بنائے گی۔ دو دن سے زیادہ کبھی نہ ٹھہرتے تھے۔ ایک خلاف توقع بات یہ ہوئی کہ کوثر بھی اس دن کے بعد سعدیہ سے ملنے گھر نہ آئی بلکہ وہ کالج سے بھی غائب ہوگئی۔ وہ کوثر کی خیریت معلوم کرنے اس کے گھر جانا چاہتی تھی

لیکن کنور صاحب کے جانے کے بعد کوثر کے گھر پہنچی تو اسے ایک خوشگوار صدمے سے دوچار ہونا پڑا وہاں پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ کوثر کی شادی ہوگئی ہے۔

"بیٹا! ہم تم کو ضرور بلاتے لیکن کوثر نے ہماری ایک نہ سنی، اسے محلوں میں رہنے کا بڑا شوق تھا قسمت کی بات کہ اس کا یہ خواب پورا ہوگیا وہ محلوں میں رہنے چلی گئی۔ بڑی رازداری اور خاموشی سے اور ساتھ ہی ہماری زبانیں بند کر گئی ہم کچھ کہنا بھی چاہیں تو کہہ نہیں سکتے، کچھ بتانا بھی چاہیں تو بتا نہیں سکتے اس لڑکی نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا۔ دولت کی چکاچوند نے اسے کیا سے کیا بنادیا، کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ بس بیٹی تم اسے معاف کردو اور اسے بھول جاؤ اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" اتنا کہہ کر کوثر کی ماں رونے لگیں۔

"کوئی بات نہیں خالہ جان اس نے شادی میں نہ بلایا نہ سہی آپ غم نہ کریں۔ میں نے اسے معاف کر دیا۔" سعدیہ اتنا کہہ کر پلٹی اور بوجھ قدموں سے گھر سے نکل آئی۔

کوثر کی اس بے رخی نے اسے بہت دکھی کر دیا تھا۔ سب سے زیادہ دکھ اسے اس بات کا تھا کہ کوثر کا اگر کسی سے افیئر تھا تو اس نے اس سے چھپایا کیوں وہ کیسی دوست تھی اس کی۔

سعدیہ نے اس بے وفائی کو اپنی توہین سمجھا اور اتنا صدمہ لیا کہ وہ دو دن تک کالج نہ جاسکی اسے بخار آگیا۔ پھر اس نے اس واقعے کو ڈراؤنا خواب سمجھ کر قبول کر لیا اور طے کر لیا کہ آئندہ وہ کسی کو اپنا دوست نہ بنائے گی۔

یہ اس واقعے کے تقریباً ایک ماہ بعد کی بات ہے، سعدیہ کو کچھ سوٹ سلوانے تھے وہ شادمان میں اپنے پسندیدہ ٹیلر کے پاس کپڑے دینے پہنچی۔ ابھی وہ گاڑی سے اتر ہی رہی تھی کہ اس نے کوثر کو ایک جیولر کی دکان سے نکلتے ہوئے دیکھا وہ بہت قیمتی لباس میں تھی اور زیور سے لدی ہوئی تھی پہلے سے اور خوبصورت ہوگئی تھی۔

کوثر کو دیکھ کر سعدیہ کو آگ لگ گئی۔ وہ گاڑی سے اترتے اترتے رک گئی سیٹ پر بیٹھ کر اس نے جلدی سے گاڑی کے شیشے چڑھالیے۔ شیشے رنگین تھے گاڑی سائیڈ سے کھڑی تھی اس لیے اسے دیکھے جانے کا کوئی امکان نہ تھا۔۔ جہاں کوثر کو دیکھ کر دل میں نفرت ابھری تھی وہاں ایک شوق بھی جاگا تھا۔ آخر وہ دیکھے تو اس کی کس کے ساتھ شادی ہوئی ہے۔ ایساوہ کہاں کا شہزادہ ہے کہ اس نے اسے بھی ہوا نہ لگنے دی۔ پھر اس نے سوچا کیا ضروری ہے کہ اس کا شوہر بھی اس کے ساتھ ہو ویسے ابھی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ اسے قوی امید تھی کہ وہ اس کے ساتھ ضرور ہو گا وہ جیولر کا حساب کرتا رہ گیا تھا کیونکہ ابھی چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ وہ دکان سے نکل کر تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔

سعدیہ نے اسے دیکھا تو دیکھتی رہ گئی، اس کی آنکھیں پتھرا گئیں دل کی دھڑکن چند لمحوں کو رک گئی اس کی روح میں ایک چیخ گونجی "اس لڑکی نے ہمیں کا کہیں نہیں چھوڑا۔ دولت کی چکاچوند نے اسے کہاں سے کہاں پہنچادیا۔ بس بیٹی تم اسے معاف کردو اس واقعے کو ایک ڈراؤنا خواب سمجھ کر بھول جاؤ۔" کہیں سے سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔

کمینی، ذلیل، میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی تجھے ڈراؤنا خواب سمجھ کر کبھی قبول نہیں کروں گی۔

سعدیہ کی آنکھیں خشک تھیں لیکن دل اندر ہی اندر رو رہا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے گاڑی اسٹارٹ کی اور گھر پہنچ کر خوب بلک بلک کر روئی یہ صدمہ بھی ایسا تھا کہ وہ جتنا روتی کم تھا کوثر کیا سے کیا بن گئی تھی۔ وہ اگر اسے تنہا مل جاتی تو سعدیہ اس کا منہ نوچ لیتی، ہو سکتا تھا اسے گولی ہی مار دیتی اتنا غصہ تھا اسے اس کی حرکت پر بہر حال اس نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ زندگی بھر کوثر کا منہ نہیں دیکھے گی چاہے ایسا کرنے میں اسے حد سے ہی گزرنا کیوں نہ پڑے۔

ابھی اس بات کو اس حادثے کو دو تین ماہ ہی گزرے تھے، سعدیہ نے جیسے تیسے کر کے خود کو نارمل کر لیا تھا کہ ایک دن وہی ہوا جس کا اسے انتظار تھا کالج سے آکر اس نے کھانا وانا کھایا تھا اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کا سوچ رہی تھی کہ کوٹھی کے گیٹ پر گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی۔

یہ ہارن اسے پہلے سنائی دیتا تو وہ خوشی سے اچھل پڑتی تھی لیکن آج اس ہارن نے اس کے جسم میں کپکپی طاری کر دی تھی غصے اور صدمے نے بیک وقت اس پر حملہ کر دیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

اس نے لرزتی انگلیوں سے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر دیکھا اس امید پر کہ شاید باہر کوئی اور منظر ہو منظر وہی تھا دلخراش اور جان لیوا۔

اتنی دیر میں ملازم نے بھاگ کر گیٹ کھول دیا تھا گاڑی اندر آگئی تھی اور اب گاڑی کے دروازے بند ہونے کی آواز آرہی تھی۔ سعدیہ کا جی چاہ رہا تھا کہ گھر کی دیواریں پھٹ جائیں اور وہ ان میں دفن ہو جائے اس نے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا اور بیڈ پر اوندھے منہ پڑی سسک رہی تھی۔

بی بی جی، کہاں ہیں؟"انہوں نے ملازم سے پوچھا۔"

"ابھی تو یہیں تھیں شاید بیڈروم میں ہیں" ملازم نے جواب دیا۔

"اچھا ہم یہاں بیٹھتے ہیں تم انہیں اطلاع کرو کہ ہم آئے ہیں" انہوں نے ایک صوفے پر آرام سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جی بہتر" ملازم اندر جانے لگا تو ساتھ آنے والی خاتون نے اسے روک دیا "آپ ٹھہریں میں خود جا کر اسے دیکھتی ہوں۔"

هاں یہ ٹھیک ہے "وہ مسکرائے انہیں یہ تجویز پسند آئی۔"

انہوں نے بیڈ روم کے دروازے کو آہستہ سے دھکا دیا لیکن وہ اندر سے بند تھا انہوں نے دروازے پر دستک دی ایک بار، دو بار، تین بار، اندر سے کوئی جواب نہ ملا مکمل خاموشی طاری تھی۔

سعدیہ دروازہ کھولو دیکھو میں آئی ہوں تمہاری دوست کوثر۔""

کوثر کی آواز سن کر سعدیہ کی روح میں کئی دھماکے ہوئے وہ جیسے ریزہ ریزہ ہو گئی۔

"سعدیہ پلیز دروازہ کھولو، میری ایک بات سن لو۔"

سعدیہ نے تو کوثر کی شکل نہ دیکھنے کی قسم کھائی تھی پھر وہ کیوں اس کے لیے دروازہ کھولتی وہ کیوں اس کی بات سنتی اس نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

پندرہ بیس منٹ تک کوثر دروازہ پیٹتی رہی سعدیہ سے دروازہ کھولنے کی التجا کرتی رہی لیکن سعدیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

تب بھاری قدموں سے چلتے کنور جہاں زیب، کوثر کے نزدیک آئے اور اسے واپس چلنے کا اشارہ کیا اب واپسی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کوثر آنسو بہاتی کنور صاحب کے ساتھ ہو لی۔

کنور صاحب کی گاڑی جانے کے بعد سعدیہ نے دروازہ کھول دیا۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے اور سر کو جھٹک کر کالج کا کام کرنے بیٹھ گئی۔ وہ آخر کنور جہاں زیب کی بیٹی تھی اس کے باپ نے شیرنی پالی ہوئی تھی تو کیا وہ یہ چھوٹے موٹے غم نہیں پال سکتی تھی۔

غم سہنا تو شائسہ بیگم نے بھی سیکھ لیا تھا۔ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود کنور جہاں زیب نے انہیں بتادیا تھا کہ ان کی زندگی چند ماہ کی ہے کیونکہ وہ سینے کے کینسر میں مبتلا ہیں۔ آپریشن ہو سکتا تھا لیکن کامیابی کی امید محض دس فیصد تھی۔ کنور صاحب نے آپریشن کروانے کے لیے زور بھی دیا لیکن شائستہ بیگم نے سختی سے انکار کر دیا۔ جب مرنا ہی تھا تو وہ چیر پھاڑ کیوں کروا کر کیوں مریں۔

شائستہ بیگم میں کنور صاحب کی دلچسپی ویسے بھی کم ہو گئی تھی۔ جب سے انہیں کینسر کا پتا چلا تھا تو پھر بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ کئی کئی ہفتے تک ان کی صورت نظر نہ آتی اگر کبھی بھولے بھٹکے اس کے پاس آ بھی جاتے تو محض دو چار منٹ ڈاکٹروں کی طرح رسمی بات کر کے چلتے بنتے۔ اس رویے کی وجہ سے شائستہ بیگم کی زندگی روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔

ابھی شائستہ بیگم سے یہی دکھ نہیں سمٹ رہے تھے کہ ایک دن پتا چلا کنور جہاں زیب نے چوتھی شادی کر لی ہے اس خبر کو انہوں نے خلاف توقع بڑے حوصلے سے سنا اور تلخی سے مسکرا دیں۔ کنور صاحب جیسے مرد سے بھلا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی، بلکہ انہوں نے شادی کرنے میں دیر کر دی تھی یہ کام تو کافی پہلے ہو جانا چاہیے تھا۔

شادی کے تیسرے دن جب کنور صاحب نے شائستہ بیگم کو شرف بازیابی بخشا تو انہوں نے عام عورتوں کی طرح کسی طعن طنز سے کام نہ لیا بڑے حوصلے سے انہیں مبارکباد دی اور ویسے بھی تلخی پیدا کر کے وہ کنور صاحب کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔

کنور جہاں زیب ان کے اس رویے سے بہت خوش ہوئے۔ خوشی کے اظہار کے طور پر انہوں نے دوپہر کا کھانا ساتھ کھانے کی درخواست کی جسے شائستہ بیگم نے فوراً قبول کر لیا۔

شادی کے تیسرے دن وہ شائستہ بیگم سے ملنے چلے آئے تھے تو اس میں ان کی مرضی کو بالکل دخل نہ تھا دراصل کنور صاحب کو کوثر یعنی چھوٹی بیگم نے بھیجا تھا وہ شائستہ بیگم سے ملنے کی خواہشمند تھی۔ شائستہ بیگم اس کی پسندیدہ ہیروئن تھی اس نے ستارہ خان کی تمام فلمیں دیکھی تھیں۔ جب اسے پتا چلا کہ شائستہ بیگم دراصل ستارہ خان ہیں تو وہ اپنی پسندیدہ ہیروئن کے لیے مچل گئی اور اس طرح کنور صاحب نے شائستہ بیگم کو کھانے پر مدعو کر لیا۔

شائستہ بیگم کے لیے اگرچہ سوکن سے ملنا ایک ناگوار فریضہ تھا۔ اگر وہ زندگی سے مایوس نہ ہو چکی ہوتیں تو کبھی اس کے سامنے نہ آتیں۔ موت کے بلاوے نے انہیں جذبات سے عاری کر دیا تھا اس لیے انہوں نے ملاقات کی ہامی بھر لی تھی۔ ویسے وہ یہ بھی دیکھنا چاہتی تھی کہ کنور صاحب اس مرتبہ کیا چیز لائے ہیں۔

شائستہ بیگم کو دیکھ کر کوثر کو خاصی مایوسی ہوئی اسے ان میں ستارہ خان کہیں بھی نظر نہ آئی، نظر آتی بھی کیسے وہ پہلی سی چمک دمک اب ان میں کہاں تھی۔ کنور صاحب کی بے رخی اور کینسر بھرے جسم نے اب ان میں کا چھوڑا تھا۔

کوثر کو دیکھ کر شائستہ بیگم کے بھی کچھ اس طرح کے تاثرات تھے، وہ انہیں ذرا بھی پسند نہ آئی اپنی باتوں اور حرکات سکنات سے وہ انہیں بڑی چھچھوری سی دکھائی دی۔ اس میں متانت اور وقار نام کی کوئی چیز نہ تھی، وہ اس حویلی کی اہل نہ تھی، لیکن کنور صاحب نے اسے اہل بنا دیا تھا جانے کنور صاحب کو اس میں کیا چیز نظر آگئی تھی کہ اس سے شادی کر بیٹھے شائستہ بیگم کی نظر میں وہ کوئی خاص حسین بھی نہ تھی۔

شائستہ بیگم اور کوثر کے درمیان یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی، اس کے بعد کسی نے ایک دوسرے سے ملنے کی خواہش ظاہر نہ کی، ویسے بھی اس کالی حویلی کا نظام کچھ عجیب سا تھا یہاں اگر کوئی اپنی مرضی سے کسی سے

ملنا چاہتا تو نہیں مل سکتا تھا۔ یوں کسی پر کوئی پابندی نہیں تھی، بظاہر آزادی تھی، لیکن حویلی کو کچھ اس طرح بنایا گیا تھا کہ بوقت ضرورت حویلی کے ایک حصے کو دوسرے سے الگ کیا جا سکتا تھا اور اس نظام کی وجہ سے کنور جہاں زیب کو مکمل آزادی تھی کہ وہ بیگمات کے علم میں لائے بغیر جو چاہیں کرتے پھریں۔

شائستہ بیگم کے پاس تین کمرے تھے۔ ان تین کمروں میں دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ بس ایک کنور صاحب موجود نہیں تھے۔ کمروں کی دیواریں جب تنگ ہوتی محسوس ہوتی تو وہ راہداری میں نکل کر ٹہلنے لگتیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کنور صاحب روز اس راہداری سے رانی کو گوشت کھلانے جاتے ہیں۔ وہ چاہتیں تو روز دروازے پر کھڑے ہو کر ان سے مل سکتی تھیں۔ لیکن انہوں نے کبھی اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ اس وقت جب کنور صاحب کی آمد کا وقت ہوتا تو وہ اپنے کمرے بند کروا کر بیٹھ جاتیں۔

آج ان کا دل گھبرا رہا تھا کہ وہ کمرے سے نکل کر راہداری میں آگئیں۔ انہیں بالکل معلوم نہ تھا کہ اس وقت کنور صاحب ادھر نکلیں گے۔ بہر حال وہ اتفاق سے انہیں اس وقت مل گئے تھے تو وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا لینا چاہتی تھیں۔

"آپ اس وقت کہاں سے آرہے تھے کنور صاحب؟" کنور صاحب کے بیٹھنے کے بعد انہوں نے اپنا سوال دہرایا۔

"میں رانی کی طرف سے آرہا تھا، کنور صاحب نے جواب دیا۔

"یہ شوق بھی آپ کا خوب ہے کنور صاحب" شائستہ بیگم نے کہا۔

"کون سا شوق؟" کنور صاحب نے پوچھا۔

"یہی شیرنی پالنے اور اسے اپنے ہاتھ سے کھلانے کا" شائستہ بیگم نے وضاحت کی۔

"ویسے کنور صاحب ہم سے اچھی تو وہ شیرنی رہی جسے آپ بڑے اہتمام اور شوق سے گوشت کھلاتے ہیں۔"

"پر آج تو رانی نے کمال ہی کر دیا۔ اب میں سوچنے لگا ہوں کہ اگر آئندہ ایسا ہوا تو پھر تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔"

"کیا ہوا؟"

"ہوا یہ کہ آج صبح میں ایک ضروری کام سے شہر گیا ہوا تھا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس آیا تو یعقوب نے عجیب اطلاع دی کہ رانی نے اس کے ہاتھ سے گوشت نہیں کھایا۔ اس نے زبردستی کھلانے کی کوشش کی تو وہ غرانے لگی۔ اس نے اسے واپس پنجرے میں بھیجنے کی کوشش کی تو وہ وہاں بھی نہ گئی۔ بس وہ پرانے زمانے کی بیویوں کی طرح بغیر کھائے میرا انتظار کرنے لگی۔"

"ارے واقعی!" شائستہ بیگم حیرت زدہ ہو گئیں۔

"ہاں اور جب میں نے اسے جا کر گوشت کھلایا تو اس نے فوراً کھا لیا اور پھر بڑے آرام سے پنجرے میں چلی گئی۔ یوں تو میں بچپن سے اسے کھلاتا آیا ہوں لیکن پچھلے کئی مہینوں سے میں بلاناغہ اسے گوشت کھلا رہا تھا وہ بھی اس بات کی عادی ہو گئی۔ یعقوب سے وہ خاصی مانوس ہے۔ اس نے بہت دفعہ میری غیر موجودگی میں گوشت کھلایا ہے اور اس نے کھایا ہے۔ لیکن آج اس نے قطعاً کھانے سے انکار کر دیا۔ یہ بات اب میرے لیے الجھن کا باعث بن گئی ہے۔ اس طرح تو میں پابند ہو کر رہ جاؤں گا۔"

"کسی کے تو پابند ہو جائیے کنور صاحب" شائستہ بیگم نے بڑی معصومیت سے بڑی گہری بات کہی۔

"شائستہ بیگم! میں شیر ہوں اور شیر کبھی کسی کا پابند نہیں ہوتا۔" کنور صاحب نے شائستہ بیگم کی بات کا معقول جواب دیا۔

"بہت خوب" وہ مسکرا دیں۔ ان کا جی چاہا کہ جواب میں کہہ دیں، آپ شیر ضرور ہیں لیکن قالین کے۔ لیکن وہ کہہ نہ سکیں۔ احترام آڑے آ گیا۔

"اور سنائیں، اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اب کچھ باقی نہیں رہا کنور صاحب" شائستہ بیگم یکایک اداس ہو گئیں۔

"ابھی بہت کچھ باقی ہے، آپ مایوس نہ ہوں شائستہ بیگم۔ میری مانیں آپریشن کروا لیں۔ یہاں کے ڈاکٹروں پر اعتبار نہیں تو لندن چلی جائیں۔"

"کیا کرنا آپریشن کرا کے؟ اب زندگی کے دن تو انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ لندن کے بجائے اب تو اوپر جانے کی تیاری کرنا چاہیے۔" کہتے کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"فضول باتیں نہیں کرو شائستہ بیگم۔" کنور صاحب نے شائستہ بیگم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کنور صاحب! کچھ عرض کروں، مانیں گے۔" اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

"کیا کہنا چاہتی ہیں بولیں۔" وہ کچھ پریشان سے ہو کر بولے۔

"پریشان نہ ہوں، اب جاتے وقت میں آپ سے کوئی ایسی چیز نہ مانگوں گی کہ آپ دے نہ سکیں۔"

"جی بولیں۔ جو مانگنا چاہتی ہیں مانگیں۔" کنور صاحب نے جی کڑا کے کہا۔

"کنور صاحب اس بات کو آپ میری وصیت سمجھ لیں۔ میں مر جاؤں تو میری میت کو گجرات بھیج دیجیے گا۔ میں اپنے والدین کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ضبط نہ کر سکیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

یہ ایک مشکل وصیت تھی۔ کالی حویلی سے ملحق کنور جہانزیب کا آبائی قبرستان تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ آبائی قبرستان چھوڑ کر انہیں والدین کے پاس گجرات روانہ کر دیا جائے۔ والدین سے تو وہ ایک مرتبہ رخصت ہو آئیں تھیں۔ وہ اب کنور جہانزیب کی بیوی تھیں، اس حویلی کی عزت تھیں۔ وہ اپنی زندگی میں اپنے والدین کے شہر نہ جا سکیں تو مر کر وہاں جانے کی کیا تک تھی بھلا۔ یا شاید اسی بات نے انہیں وصیت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اس کالی حویلی کے فسوں سے نکل جانا چاہتی تھیں۔ اس حویلی نے انہیں دیا کیا تھا؟ کالی راتیں اور سنسان دن؟ ان اونچی دیواروں کے درمیان ان کا سانس گھٹنے لگا تھا۔ اب وہ چاہتی تھیں کہ ان کا جسم اس کالی حویلی کی حدود سے نکل کر بابل کی چھاؤں میں پہنچ جائے۔ زندہ رہ کر تو وہ اس آزار سے نجات پا نہ سکیں، مر کر تو پا سکتی تھیں۔

اس وصیت نے کنور صاحب کی انا کو ٹھیس پہنچائی۔ انہوں نے اپنی توہین محسوس کی۔ ان کے آبائی قبرستان میں دفن ہونا بھی کنور صاحب کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی۔ جس سے شائستہ بیگم محروم ہونا چاہتی تھیں۔ وہ ان کی جگ ہنسائی کروانا چاہتی تھیں۔ آخر یہ کس طرح ممکن تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھیں۔ جب وہ کافی دیر تک اسی طرح روتی رہیں تو کنور صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا، نہ تسلی کے کلمات کہے۔ تو انہوں نے روتے روتے اچانک سر اٹھایا کہ دیکھیں کنور صاحب کیا کر رہے ہیں۔

کنور صاحب وہاں نہ تھے، وہ کب کے جا چکے تھے۔

ان کی خالی کرسی دیکھ کر ان کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ سینے میں درد نے ایک نئی کروٹ لی۔ ان کی نگاہوں میں اپنوں کے چہرے گھومنے لگے۔ وہ گھر، جہاں وہ پیدا ہوئیں، پلی بڑھیں، ان کی نگاہوں میں سمانے لگا۔ یہ

ابو ہیں، یہ امی ہیں، یہ بھائی جان ہیں، وہ آپا جان ہیں، لو وہ ماموں آ گئے، ادھر وہ چچا بیٹھے ہیں۔ ان کی آنسو بھری آنکھوں میں ان کے اپنے ابھر اور ڈوب رہے تھے۔ وہ ایک ایک کر کے سب کو یاد کر رہی تھیں۔ زندوں کو بھی اور مردوں کو بھی۔ ان کی آنکھوں میں تاریکی بڑھ رہی تھی۔ سانس دھیرے دھیرے اور کھنچ کر آ رہی تھی۔ ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔ انگلیاں لرز رہی تھیں۔ جسم میں کپکپی طاری تھی اور موت نزدیک سے نزدیک ہوتی جا رہی تھی۔

عصر کے وقت کنور جہانزیب کو شائستہ بیگم کے انتقال کی خبر ملی۔ فوری طور پر تدفین کے انتظامات کیے گئے اور کوزی رات کے آٹھ بجے تک انہیں کالی حویلی سے ملحق کنور جہانزیب کے آبائی قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔ اس طرح کہ کوئی انہیں رونے والا نہ تھا، نہ کندھا دینے والا۔

شائستہ بیگم کے والدین کا تو خیر انتقال ہو چکا تھا، لیکن ان کے بھائی، بہن، چچا، ماموں تو تھے۔ ان کو بھی اطلاع نہیں کی گئی اور اس طرح انہوں نے ان کی وصیت پر عمل درآمد کیا۔ گویا اس وصیت کا انتقام لیا۔ وہ مر کر بھی چین نہ پا سکیں۔

اگر لوگ اس کو کالی حویلی کہتے تھے تو ٹھیک کہتے تھے۔ اس کی سفید دیواروں کے پیچھے کتنا گھور اندھیرا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ کالی حویلی میں کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے اور کیا ہو چکا ہے، یہ کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

اس وقت جب یعقوب مودبانہ چلتا ہوا ان کے سامنے پہنچ کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا تو وہ اپنے آفس میں بیٹھے کچھ فائلوں کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ کالی حویلی کے ایک حصے میں انہوں نے اپنا دفتر بنا رکھا تھا۔

فائل دیکھتے دیکھتے انہوں نے نظر اٹھائی، جس کا مطلب تھا، ہاں کہو کیا بات ہے۔

"سرکار! تدفین ہو گئی ہے۔" یعقوب یہ کہہ کر چند لمحے کھڑا رہا، لیکن کنور صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دوبارہ اسی انہماک سے فائلیں دیکھنے لگے۔ اب یعقوب کا مزید یہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ وہ خاموشی سے الٹے قدموں واپس لوٹا اور دروازے میں گُم ہو گیا۔

فائل دیکھتے دیکھتے اچانک انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کمرے میں آیا ہو۔ انہوں نے چونک کر چاروں طرف دیکھا، کوئی نہ تھا۔ البتہ کھڑکی کا پردہ ضرور ہل رہا تھا۔

"میں مر جاؤں تو میری میت کو گجرات بھیج دیجیئے گا۔۔ میں اپنے والدین کے پہلو میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔"

ذہن کے کسی گوشے میں شائستہ بیگم کی آواز سنائی دی اور پھر ان کا چہرہ نگاہوں میں آ گیا۔ کچھ اس طرح جیسے وہ سامنے بیٹھی ہیں۔ کنور جہانزیب بڑے مضبوط اعصاب کے آدمی تھے، لیکن اس وقت انہیں کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ دل میں خلش سی اٹھی تھی کہ مرنے والی کی وصیت کو ٹھکرا کر شاید انہوں نے غلطی کی تھی۔ ابھی ندامت کا احساس گہرا نہ ہو پایا تھا کہ کنور جہانزیب نے اپنے سر کو جھٹک دیا، نہیں انہوں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔۔۔ بلکہ شائستہ بیگم نے اس طرح کی وصیت کر کے ان کے وقار کو دھچکا پہنچایا تھا، غلطی انہوں نے کی تھی۔ ابھی وہ اسی ذہن خلفشار میں تھے کہ چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں داخل ہوئی۔

"ہاں، بولو"

"سرکار چھوٹی بیگم آپ کا کھانے پر انتظار کر رہی ہیں۔"

"ان سے کہو کہ ہم کھانا نہیں کھائیں گے۔"

یہ سن کر وہ الٹے قدموں تیزی سے واپس چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد کنور صاحب کرسی سے اٹھے اور کھڑکی کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ باہر گہرا اندھیرا چھایا تھا۔

چند سیکنڈ اندھیرے کو گھور کر وہ واپس پلٹے۔ تب انہوں نے دیکھا کہ چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں موجود ہے۔

"ہاں" کنور صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"بیگم صاحبہ نے پوچھا ہے خدانخواستہ آپ کی طبیعت تو خراب نہیں۔"

"ان سے کہو، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"جی بہتر" وہ پھر الٹے قدموں واپس لوٹ گئی۔ کنور جہانزیب آہستہ آہستہ چلتے صوفے پر نیم دراز ہو گئے۔ ایک بے کلی سی تھی، بے چینی سی تھی، ابھی وہ اس بے کلی، بے چینی کے بارے میں سوچ ہی رہے تھے کہ وہ ملازمہ پھر وارد ہو گئی۔

"کیا ہے؟" کنور صاحب کے لہجے میں سختی تھی۔

"سرکار، بیگم صاحبہ آنے کی اجازت طلب کر رہی ہیں۔" ملازمہ کانپتے ہوئے بولی۔

"نہیں"

"بہتر سرکار" وہ ملازمہ لرزتے قدموں سے فوراً واپس ہو گئی۔

ملازمہ کے جانے کے بعد انہوں نے گھنٹی بجائی، تھوڑی دیر بعد یعقوب کمرے میں داخل ہوا، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

"جی سرکار"

"یعقوب میرا کمرہ کھلوا لو اور باقی سب بند کر دو۔"

یہ ایک خاص جملہ تھا جس کا مطلب یعقوب خود سمجھتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کون سا کمرہ کھولنا ہے اور کیا بند کرنا ہے۔ اس نے حویلی سے آنے والے تمام دروازوں کو ایک ایک کر کے بند کر دیا۔ پھر وہ دروازہ کھولا، جس میں ان کے مہ خانہ تھا۔ ایک شیشے کی الماری میں دنیا بھر سے جمع کی گئیں خوبصورت بوتلیں سجی تھیں۔ جہاں ایک حسین خواب گاہ تھی۔ خوشبوؤں میں بسا نرم ملائم بستر تھا۔ چودہ سسٹم ٹیلی ویژن تھا، تو چودہ سسٹم وی سی آر تھا۔ ایک ریک پر رکھے وہ ویڈیو کسیٹ تھے جن میں بجلیاں بھری تھیں۔ ان کڑکتی مچلتی بجلیوں کا ان کے پاس بہت اچھا ذخیرہ تھا۔ دنیا کا اعلیٰ ترین ساؤنڈ سسٹم اس کمرے میں نصب تھا۔ بے شمار کیسٹ تھے، بعض کیسٹ تو ایسے تھے جنہیں سننے کا انہیں موقع ہی نہیں ملا تھا۔ سرسراتے پردے، قد آدم پینٹنگز، چھت سے جڑے ہوئے آئینے جو سکون کے لمحات کو دوبالا کر دیتے تھے۔ غرض کمرہ کیا تھا ایک چھوٹی جنت تھی اور یہ جنت حویلی کے ایک تہ خانے میں آباد تھی۔ اس تہ خانے کے بارے میں صرف دو آدمیوں کو معلوم تھا۔ ایک کنور صاحب اور دوسرے یعقوب۔

یعقوب اس حویلی کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ جتنا پرانا تھا، اتنا ہی وفادار تھا۔ اس کے سامنے کنور صاحب کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی، لیکن ایسی کتاب جسے تکیے کے نیچے چھپا کر پڑھا جائے۔ وہ کنور صاحب کا رازداں تھا، جتنا رازداں تھا، اتنا ہی مہذب اور فرماں بردار تھا۔

کنور صاحب بیڈ پر بیٹھ گئے۔ یعقوب نے نرم ملائم تکیے ان کی کمر کے پیچھے رکھ دیئے۔ کنور صاحب نے ان تکیوں سے ٹیک لگائی، پھر یعقوب نے دو تکیے کہنیوں کے نیچے رکھ دیئے۔ کنور صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا لیے اور بولے۔

"کپتان صاحب کی بھجوائی ہوئی چیز نکالو۔"

"جی سرکار۔" یعقوب نے اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کو کھولا اور ایک چھوٹی سی شیشے کی میز بیڈ کے نزدیک لا کر رکھ دی۔ پھر اس نے شیشے کی الماری میں سجی چمچماتی بوتلوں پر نظر ڈالی۔ تب اسکی ایک بوتل پر نظر ٹھہر گئی۔ کپتان صاحب کی بھجوائی ہوئی چیز وہی تھی۔

اس حکم کی تعمیل کے بعد یعقوب پھر ہاتھ باندھ کر مودبانہ کھڑا ہو گیا۔

"ذرا کیسٹ نکالو" کنور صاحب نے مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

لیکن یہ ایک مبہم حکم تھا کنور صاحب اس وقت وی سی آر پر کیا دیکھنا چاہ رہے تھے۔ کون سا کیسٹ نکلوانا چاہ رہے تھے۔ کچھ اندازہ نہ تھا۔ وہ ان کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ بہر حال وہ ان کا حکم سنتے ہی فوراً ایک کی طرف بڑھا اور یونہی کیسٹوں پر ہاتھ مارنے لگا۔ تب پشت سے آواز آئی۔

"دوسری قطار میں پانچواں کیسٹ" کنور جہانزیب اس عمر میں بھی بہترین یاداشت کے مالک تھے۔

یعقوب نے دوسری قطار سے فوراً پانچواں کیسٹ نکالا اور وی سی آر میں لگا کر اسے آن کر دیا اور ریموٹ کنٹرول داہنے ہاتھ کے نزدیک تکیے پر رکھ دیا۔

"یعقوب!" کنور صاحب کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں۔

"جی سرکار"

"کچھ انتظام نہیں ہو سکتا۔"

"جی ہو سکتا ہے سرکار! نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟" یعقوب نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں ایک گھنٹے میں کچھ لے کر واپس آتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔" کنور صاحب نے ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

یہ حویلی سے تین چار گھنٹے کی مسافت پر واقع تھی۔ اس وقت شہر جانا اور وہاں سے کچھ لانا مشکل تھا۔ صبح ہو جاتی، اس نے عالم گڑھ کے علاقے سے ہی کچھ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ حویلی عالم گڑھ کے وسط میں واقع تھی۔ اس کے چاروں اطراف میں گاؤں آباد تھے اور ان دیہاتوں میں ہر طرف کنور زیب کے کارندے پھیلے ہوئے تھے۔

یعقوب نے گیراج سے جیپ نکالی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ کدھر جائے تب اس نے شیر پور جانے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ وقت مقررہ پر تہ خانے میں واپس داخل ہوا تو مطلوبہ چیز اس کے ساتھ تھی۔ جو فاختہ کی طرح سہمی، سمٹی، لرزتی، کانپتی کنور جہانزیب کے روبرو کھڑی تھی۔ یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کالی حویلی سے وہ زندہ واپس جائے گی یا لاش کی صورت میں۔

کنور جہانزیب نے اس لڑکی کو گہری نظروں سے دیکھا اور پھر ایک سفاک مسکراہٹ ان کے چہرے پر بکھر گئی۔

"کوڑا لاؤ"

"جی سرکار"

کنور جہانزیب بیڈ سے ایک عفریت کی طرح اٹھے۔ ان کا چہرہ ایک دم بھیانک ہو گیا۔ دانت جیسے باہر نکل آئے، زبان سانپ کی طرح لپلپانے لگی۔

یعقوب کوڑا دے کر بہت تیزی سے تہ خانے سے نکل گیا۔ تب کنور صاحب نے کوڑا فضا میں لہرایا۔ چند سیکنڈ بعد ایک چیخ تہ خانے میں گونجی اور پھر کوڑا بار بار فضا میں بلند ہوتا رہا اس کے ساتھ ہی دردناک چیخیں بھی سنائی دیتی رہیں۔

کنور جہانزیب کا یہ ایک خاص شغل تھا۔ کوڑے مار مار کر نازک جسموں کو زخمی کرنا اور پھر ان کو تڑپتا دیکھ کر آسودگی حاصل کرنا، سرشار ہونا۔ اس اذیت ناک کھیل میں انہیں بڑا لطف آتا تھا۔ کوڑتے مارتے مارتے ان پر نشہ سا چھا جاتا، غنودگی طاری ہو جاتی اور وہ نڈھال ہو کر بیڈ پر گر پڑتے اور سکون ہو کر سو جاتے۔

کنور صاحب کی شکل وصورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس قدر سفاک ہیں۔ یہ بات تو صرف انہیں معلوم تھی یا تہ خانے کی ان دیواروں کو، یا پھر وہ جانتی جس پر یہ قیامت گزرتی۔ اگر وہ یہ مار نہ سہہ سکتی، مر جاتی تو پھر کسی سے کچھ کہنے کا سوال ہی نہ تھا۔ اگر زندہ بھی رہتی تو اس میں زبان کھولنے کی جرات نہ رہتی۔ بونوں کی بستی میں دیو سے ٹکر لینے والا کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی کوشش بھی کرتا تو اسے چیونٹی کی طرح مسل دیا جاتا۔

صبح حسب معمول وہ اپنی چہیتی گھوڑی برق فشاں کی پیٹھ پر سوار ہو کر سیر کو نکلے۔ جب وہ واپس آئے تو آفتاب کالی حویلی کے پیچھے سر ابجار رہا تھا۔ وہ حویلی کے بڑے پھاٹک میں داخل ہوئے ہی تھے کہ اچانک ان کے سامنے ایک عورت آ گئی۔ اس نے بھاگ کر گھوڑی پر بیٹھے ہوئے کنور صاحب کا پاؤں پکڑ لیا اور انہیں دعائیں دینے لگی۔

کنور صاحب نے بڑی آہستگی سے اپنا پاؤں رکاب سے نکالا اور چھلانگ لگا کر نیچے آئے۔ ملازم نے برق فشاں کی لگام پکڑلی۔ ایک اور ملازم نے اس عورت کو کھینچ کر پیچھے کرنا چاہا مگر کنور صاحب نے اسے روک دیا اور اس عورت کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

"سرکار! میں ایک غریب بیوہ ہوں۔ میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے۔ مگر میرے پاس دینے کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں۔ میں بہت پریشان ہوں سرکار میری کچھ مدد کر دیں۔" یہ کہہ کر اس ادھیڑ عمر عورت نے کنور صاحب کے پاؤں چھونے کی کوشش کی مگر کنور صاحب دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

"مائی مجھے گناہگار نہ کرو" پھر انہوں نے اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔

"اسد"!

"جی سرکار!" اسد آواز سنتے ہی آگے بڑھا۔

"اس مائی کو اپنے پاس بیٹھاؤ، مینجر صاحب آجائیں تو ان سے اسے پچیس ہزار دلوا دو۔"

"جی، بہت بہتر سرکار۔"

"کیوں مائی ٹھیک ہے"

"اللہ آپ کو خوش رکھے سرکار! آپ جیسے خدا ترس لوگوں سے یہ دنیا آباد ہے۔ آپ نہ ہوں تو دنیا دنیا نہ رہے، جہنم بن جائے۔"

کنور صاحب مسکراتے ہوئے آگے بڑھے۔ پھر چند قدم چل کر رک گئے۔ پلٹ کر دیکھا اور اسد کو اپنے نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔ اسد تقریباً دوڑتا ہوا ان کے نزدیک آیا۔

"جی سرکار"!

"اسد! یہ بڑھیا اندر کیسے آئی؟"

"سرکار یہ غلطی مجھ سے ہوئی"

"اچھا" یہ کہہ کر کنور صاحب حویلی کی طرف بڑھ گئے۔ حسب معمول حمام تیار تھا۔ اس جدید ترین باتھ روم میں داخل ہونے سے پہلے انہوں نے ایک ملازم کو یعقوب کو بلانے کا حکم دیا۔

جب وہ باتھ روم سے باہر آئے تو انہوں نے یعقوب کو ہاتھ باندھے کھڑا دیکھا۔ وہ یعقوب کو دیکھ کر مسکرائے۔

"یعقوب ہمیں اسد جیسے بے وقوف ملازموں کی ہرگز ضرورت نہیں، اس کی فوراً چھٹی کر دو۔ اس بڑھیا نے ہمارا موڈ آف کر دیا اور یہ سب اس احمق کی وجہ سے ہوا۔ لیکن اس بڑھیا کو پیسے ضرور دلوا دینا۔"

"بہتر سرکار! میں سمجھ گیا ابھی آپ کے حکم کی تعمیل ہوئی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر یعقوب الٹے قدموں واپس لوٹا اور پھر تیزی سے دروازے سے نکل گیا۔

کنور جہانزیب کو غریب بیوہ سے ہمدردی تھی۔ یہ غریب ملازم سے وہ چاہتے تو اس بیوہ کو دھکے دے کر باہر نکلوا سکتے تھے۔ لیکن وہ بے وقوف آدمی نہ تھے۔ پچیس ہزار دے کر انہوں نے پچیس لاکھ کی پبلسٹی کمائی تھی۔ پچیس ہزار ان کے لیے پچیس سو جیسے تھے۔ وہ کروڑوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ اس بیوہ نے اپنے علاقے میں جا کر کنور صاحب کی سخاوت کی تعریف کی اور یہ بات سینہ بہ سینہ ایک گاؤں سے پچیس گاؤں میں پھیل گئی۔ لیکن یہ کتنوں نے جانا ہوگا اور کس نے یقین کیا ہوگا کہ پچیس ہزار دن دینے والے سخی نے اس بڑھیا کی وجہ سے اپنے ملازم کو نکال دیا۔ غریب ملازم کو نکال کر کنور صاحب نے دوسرے پہریداروں کی آنکھیں کھول دیں۔ تا کہ یہ واقعہ پھر نہ دہرایا جا سکے۔

جب چھوٹی بیگم کی ملازمہ خاص کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے کنور صاحب کو خلاف توقع وہاں نہ پایا۔

چھوٹی بیگم ناشتے کی میز پر ان کا انتظار کر رہی تھیں اور وہ کسی کو بتائے بغیر حویلی سے غائب تھے۔ وہ یعقوب کے ساتھ قبرستان میں گھوم رہے تھے۔ شائستہ بیگم کے جنازے میں شرکت نہ کر کے انہوں نے اپنے تئیں اپنی زخمی انا کو تسکین دے لی تھی۔ ساتھ ہی اپنی سفاکی کی نظیر قائم کر دی تھی۔ اب وہی کنور صاحب ایک درد مند دل لیے شائستہ بیگم کی قبر پر کھڑے پھولوں کی چادر ڈال رہے تھے۔

کنور صاحب کی شخصیت بڑی پیچیدہ تھی۔ کسی اور کی سمجھ میں تو وہ کیا خاک آتے، خود اپنا آپ انہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

قبرستان سے فارغ ہو کر انہوں نے دو ملازمین کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھایا اور خود شہر کی جانب روانہ ہو گئے۔ یہ نفس نفیس شائستہ بیگم کی موت کی اطلاع دینے۔

جب ملازمہ خاص نے کنور صاحب کے حویلی میں نہ ہونے کی اطلاع چھوٹی بیگم کو دی تو انہوں نے یعقوب کو طلب کیا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کنور صاحب نے نہ صرف ساتھ کھانا کھانے سے انکار کیا تھا بلکہ شرف بازیابی سے بھی محروم کر دیا تھا، اور اب وہ ناشتے کے بغیر ہی حویلی سے نکل گئے تھے۔ رات وہ کہاں رہے، کسی کو معلوم نہ تھا۔

یعقوب نے اندر آ کر چھوٹی بیگم کو ادب سے سلام کیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"حکم بیگم صاحبہ۔"

"کنور صاحب کہاں چلے گئے؟"

"جی وہ قبرستان تشریف لے گئے تھے اور وہاں سے گجرات چلے گئے۔" یعقوب نے بتایا۔

"گجرات؟ آخر کیوں؟" چھوٹی بیگم نے پوچھا۔

وہ بڑی بیگم صاحب کے انتقال کی خبر دینے گئے ہیں۔

"ارے! آخر خود جانے کی کیا ضرورت تھی۔ کسی ملازم کو بھیج دیا ہوتا؟"

"بس جی سرکار کی مرضی وہ خود چلے گئے۔"

"دیکھو یعقوب، میں تم سے ایک بات پوچھ رہی ہوں۔ سچ سچ بتانا۔ دیکھو جھوٹ نہ بولنا۔"

"آپ فرمائیں جی، میں بھلا آپ سے جھوٹ کیسے بولوں گا۔"

"کنور صاحب کل رات کہاں تھے؟"

یہ سوال سن کر یعقوب ایک دم سٹپٹا گیا۔ کنور صاحب نے چار شادیاں کی تھیں۔ یعقوب نے ساری بیگموں کو دیکھا تھا۔ کسی نے آج تک صاحب کے شب و روز کے بارے میں اس طرح سوال نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹی بیگم کا یہ سوال سن کر وہ چکرا گیا اور ابھی وہ جواب سوچ ہی رہا تھا کہ چھوٹی بیگم نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسکے ہاتھ پر قرآن شریف رکھ دیا اور بولیں۔۔۔

"اب بتاؤ۔"

یہ ایک کٹھن مرحلہ تھا سچ بولتا تو مالک کا راز فاش ہوتا اور جھوٹ بولتا تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا۔

"ایسا کیوں کر رہی ہیں بیگم صاحبہ، ایسا نہ کریں۔" یعقوب نے انہیں حلف اٹھانے سے باز رہنے کی تلقین کی۔ اس تلقین میں ایک تنبیہ شامل تھی، وہ انھیں ڈھکے چھپے معنوں میں بتانا چاہتا تھا کہ اس طرح انھیں کہیں نقصان نہ پہنچ جائے۔

"میں نے جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" چھوٹی بیگم نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"بیگم صاحبہ رات کو وہ قبرستان میں رہے، بڑی بیگم کی قبر پر فاتحہ خوانی کرتے رہے، صبح تڑکے وہاں سے پلٹے۔"

"لیکن انھوں نے بڑی بیگم کے جنازے میں تو شرکت نہیں کی؟"

"وہ جی کہتے تھے کہ میں بڑی بیگم صاحبہ کو دفن ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ انھیں بڑی محبت تھی جی ان سے۔" یعقوب کو اچانک احساس ہوا کہ آخری جملہ اس نے غلط کہہ دیا ہے، اس لیے فوراً جملے کے بھاری پن کو دور کرنے کے لیے بولا۔

"بالکل ویسی ہی جیسی آپ سے ہے۔"

"اچھا اچھا۔" چھوٹی بیگم نے اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔

"ایک بات غور سے سن لو اس بات کا ذکر کسی اور تک نہ پہنچے میرا مطلب سمجھ گئے تم۔"

"جی میں کسی سے خاص طور پر کنور صاحب سے اسکا ہرگز ذکر نہیں کروں گا۔"

یعقوب نے ان کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم جا سکتے ہو۔" چھوٹی بیگم نے اس کے ہاتھ سے قرآن شریف لے لیا۔ یعقوب سر جھکائے ان کے کمرے سے نکلا اسکے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ طوفان اٹھ رہے تھے۔ جھوٹی قسم کھانے، جھوٹا حلف اٹھانے پر اس کا ضمیر اسے سرزنش کر رہا تھا، مالک کے کرتوت چھپانے کے لیے اس نے یہ سب کیا تھا۔ اس نے اپنے مالک سے وفا کی تھی مگر سب کے مالک سے دغا کیا تھا۔ بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔

چھوٹی بیگم اسکے حلف اٹھانے کے باوجود مطمئن نہ تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ شائستہ بیگم سے تو وہ کب کا ترک تعلق کر چکے تھے۔ پھر رات کو اٹھ کر قبرستان جانا اور فاتحہ خوانی کرنا کیا معنی رکھتا تھا۔ لیکن یعقوب کے بین کو جھٹلانے کے لیے بھی اس کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہ تھی بس اندر سے دل نہ مانتا تھا۔

دوپہر کو کنور جہانزیب شہر سے واپس لوٹے تو انکے ساتھ شائستہ بیگم کی بہن اور بھائی تھے۔ دونوں سوگوار اور اداس تھے۔ کنور صاحب نفس بہ نفیس انہیں شائستہ بیگم کی قبر تک لے گئے۔ وہاں سب نے فاتحہ خوانی کی۔ اور حویلی میں آ گئے شام تک وہ دونوں حویلی میں رہے اس حویلی میں انہیں دم گھٹنے کا احساس ہو رہا تھا۔

یہ حویلی ایک طرح کا محل تھا۔ زندگی کی ہر آسائش جدید انداز میں یہاں موجود تھی۔ پھر بھی ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر طرف کانٹوں بھرے تار پھیلے ہوں جو روح کو لہولہان کر رہے ہوں۔

وہ دونوں شام کو کنور صاحب سے اجازت لے کر پنے گھر روانہ ہو گئے، ویسے بھی اب یہاں رہنے کا کیا فائدہ تھا۔ جس سے رشتہ تھا وہی نہ رہی تو اب کس کے لیے رکتے۔

یعقوب پورے دن عجیب کرب میں مبتلا رہا اسے مہمانوں کے واپس جانے کا بے چینی سے انتظار تھا وہ گئے تو اس نے سکھ کا سانس لیا وہ فوراً کنور صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یعقوب وہ واحد ملازم تھا جسے کنور صاحب نے ہر جگہ اور ہر وقت ملاقات کی اجازت دے رکھی تھی اس وقت کنور صاحب دن بھر کے تھکے ہارے بستر پر لیٹے ہوئے تھے آنکھوں میں غنودگی چھا رہی تھی۔ وہ سونا چاہ رہے تھے کہ یعقوب کمرے میں وارد ہوا۔

کنور جہاں زیب کو اسوقت اسی آمد سخت ناگوار گزری اگر کوئی اور ملازم ہوتا تو اسکا حساب آج ہی صاف ہو جاتا۔ یعقوب اسوقت بے وقت آیا تھا۔ لیکن کنور صاحب جانتے تھے کہ وہ ضرور کوئی اہم خبر لے کر آیا ہے ورنہ ہرگز اس وقت کنور صاحب کے آرام میں مخل نہ ہوتا۔

وہ لیٹے لیٹے تکیے پر ذرا اونچے ہوگئے۔ اور سنجیدہ لہجے میں بولے؛

"یعقوب تم اس وقت یہاں؟"

"معافی چاہتا ہوں سرکار۔ بے وقت مخل ہونے کی سو بار معافی چاہتا ہون۔ پر آپکا نمک خوار ہوں آپکے ساتھ نمک حرامی نہیں کر سکتا۔" یعقوب سینے پر ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے آدھا جھک گیا۔

"ہوا کیا؟"

"سرکار صبح چھوٹی بیگم صاحبہ نے طلب کیا تھا۔"

"تمہیں آخر کیوں؟"

"وہ جی آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ رات آپ کہاں تھے؟"

"کیا؟" یہ سن کر ان کی نیند فورا ہوا ہوگئی وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور غصے سے آنکھیں پھاڑ کر بولے

"وہ ہمارے بارے میں پوچھ رہی تھیں؟"

"جی سرکار، انھوں نے آپ کے بارے میں نہ صرف پوچھا بلکہ میرے ہاتھوں میں قرآن مجید رکھ دیا تاکہ میں جو کہوں سچ کہوں۔"

"پھر تم نے سچ کہہ دیا۔"

"نہیں سرکار! ایسا نہیں ہو سکا اللہ مجھے معاف کرے میں نے انہیں بتایا کہ آپ قبرستان میں رہے رات بھر بڑی بیگم صاحب کی قبر پر" یعقوب نے جو کہا تھا بیان کر دیا۔

یہ بیان سن کر وہ ایکدم خاموش ہوگئے جیسے اندر ہی اندر ابل رہے ہوں۔ پھٹ رہے ہوں، بہہ رہے ہوں۔

"اچھا۔" کچھ دیر بعد وہ گویا ہوئے۔

"بعض عورتوں کو خوشی راس نہیں آتی یہ چھوٹی بیگم بھی انہی میں سے ایک ہیں انہوں نے خود اپنے ہاتھوں خوشقسمتی کو بدقسمتی میں بدل لیا ہے۔ یعقوب تم یوں کرو کہ حدبندی کر دو۔"

"جی بہتر سرکار۔" یعقوب کنور جہاں زیب کا فیصلہ سن کر الٹے قدموں پیچھے ہٹا اور پھر تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

کنور جہاں زیب کو جب اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ تڑپ تڑپ کر روئیں مگر وہاں انکی آہیں کراہیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ تقدیر اپنا کھیل کھیل چکی تھی۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب پچھتانا بے کار تھا کہائے میں نے کیوں یعقوب سے کنور صاحب کے بارے میں پوچھا۔ کاش ایسا نہ کرتی۔

کنور صاحب کے فیصلے پر فوری عمل ہوا تھا۔ چھوٹی بیگم کو انکے کمرے تک محدود کر دیا گیا۔ تمام دروازے بند کر دئے گئے۔ ایک ملازمہ کے علاوہ سب کے آنے جانے پر پابندی لگادی گئی اور وہ بھی سرف ضروریات زندگی پہنچانے کی حد تک آجا سکتی تھی۔

اور یوں چھوٹی بیگم مالکن سے ایک قیدی بن کر رہ گئی اور یہ سب ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہوا وہ کنور صاحب جیسے شاہانہ مزاج آدمی کو سمجھ نہ سکیں ان کی کسی بیوی نے کبھی ٹوہ لینے کی کوشش نہ کی تھی۔ وہ جانتی تھیں کہ

ایسا کر کے محض اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گی۔ کنور صاحب کسی طرح باز آنے والے تھے انہیں کون روکنے والا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔

چھوٹی بیگم نے کتنی مرتب اس ملازمہ سے جو کھانا اور ضروریات زندگی مہیا کرنے پر معمور تھی کنور صاحب کو پیغام بھجوایا کہ صرف ایک بار انہیں ملاقات کا شرف بخش دیں لیکن وہاں سے ٹکا سا جواب ملا تھا۔

"نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

جب وہ کنور صاحب سے مایوس ہو گئیں تو انہوں نے پندرہ بیس دن کے بعد پھر پیغام بھجوایا، چلیے آپ نہ ملیے مجھے تو اس قید تنہائی سے آزاد فرما دیجیے۔

پھر وہی ٹکا سا جواب ملا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔

پھر دو تین مہینے اسی طرح دیواروں سے سر ٹکراتے بند دروازوں کو گھورتے کبھی چیختے چلاتے گزر گئے تو چھوٹی بیگم نے ایک فیصلہ کن پیغام بھیجا، "کنور صاحب براہ کرم مجھے طلاق دے دیجیے۔"

ادھر سے پھر وہی جواب ملا، "نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔"

کنور صاحب نہ ملتے تھے، نہ طلاق دیتے تھے اور نہ آزاد کرتے تھے۔ اب سوائے اسکے کوئی چارہ نہ تھا کہ صبر کریں اور کسی معجزے کا انتظار کریں۔

خیر ان اونچی اونچی دیواروں میں معجزہ تو کیا ہونا تھا ہاں یہ ضرور ہوا کہ فہد کوثر کی تلاش میں حویلی آ پہنچا خود تو مصیبت میں گرفتار ہوا ہی کنور صاحب کے دل میں چھوٹی بیگم کے لیے جو تھوڑا بہت نرم گوشہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا اور کنور صاحب کسی شیر کی طرح بپھر اٹھے۔

ایک دن کنور جہاں زیب باغ میں بیٹھے مشروب سے دل بہلا رہے تھے رانی ان کے دائیں جانب کرسی کے پاس پاؤں پھیلائے بیٹھی تھی کنور صاحب گاہے بگاہے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور گھونٹ گھونٹ کر کے زندگی کی تلخیوں کو پیتے جاتے تھے۔ اچانک کچھ شور سا اٹھا۔

کنور صاحب نے نظر اٹھا کر دیکھا تو انہیں یعقوب نظر آیا، جو ایک سوٹ پوش کو دھکے دیتا ہوا لا رہا تھا۔ پھر قریب آ کر اس نے نوجوان کو اس طرح دھکا دیا کہ وہ رانی کے قدموں میں گرا۔ رانی اچھل کر غرائی۔ سوٹ پوش کی شیرنی کو دیکھ کر سٹی گم ہو گئی۔ اس نے تڑپ کر اٹھنا چاہا مگر یعقوب نے اس کے سینے پر بندوق رکھ دی۔

کنور صاحب نے رانی کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ پیچھے ہٹ کر کسی پالتو بلی کی طرح بیٹھ گئی۔ یعقوب نے اس سوٹ پوش نوجوان کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ اور کنور صاحب کے قدموں میں لا ڈالا۔

"کیا معاملہ ہے؟" کنور صاحب نے یعقوب سے پوچھا۔

"یہ بدمعاش آج صبح سے حویلی کے گرد مشکوک انداز میں چکر کاٹ رہا تھا۔"

"کون ہے یہ؟"

"یہ لاہور سے آیا ہے سرکار اور کیوں آیا ہے یہ آپ کو داس سے معلوم کر لیں۔"

"اچھا تم ذرا اسے اٹھا کر کرسی پر بٹھاؤ اور بندوق کندھے پر ڈالو۔" کنور صاحب نے حکم دیا۔

یعقوب نے فوراً اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور اپنی بندوق کندھے پر ڈال کر اس کی پشت پر کھڑا ہو گیا۔

"ہاں صاحبزادے کچھ بولیں۔ کیا معاملہ ہے آخر؟" کنور صاحب نے براہ راست اس نوجوان سے سوال کیا۔

"مجھے بلاوجہ ان لوگوں نے پکڑ لیا ہے.جی میرا کوئی قصور نہیں۔"اس نوجوان نے رانی کی طرف دیکھتے ہوئے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

فہد احمد، میں لاہور سے آیا ہوں.جی۔"

"کس سے ملنے؟"

"میں شیر پور آیا تھا.جی وہاں میرے ماما رہتے ہیں اب میں واپس لاہور جارہا تھا کہ ان لوگوں نے مجھے پکڑ لیا بالکل بے قصور۔""ابھی تو تم نے کچھ اور کہا تھا، یہ ایک ایک منت میں بیان بدلتا ہے، دیکھ سچ بول ورنہ چلاتا ہوں گولی۔"یعقوب نے کندھے سے بندوق اتار لی۔

"یعقوب تم ذرا خاموش رہو۔"کنور صاحب نے فہد کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں فہد صاحب دیکھیں میرے پاس وقت کم ہے جلدی سے اصل بات بتادیں۔"

بس.جی اصل بات کیا بتاؤں، اصل بات تو یہی ہے آپ شیر پور جاکر تصدیق کروالیں کہ میرے ماما وہاں رہتے ہیں کہ نہیں۔"

تمہارے ماما ضرور وہاں رہتے ہوں گے میں یقین کرلیتا ہوں مگر تم حویلی کے گرد چکر کیوں کاٹ رہے تھے۔"

"نہیں تو.جی،"میں تو اسٹیشن جارہا تھا کہ انہوں نے پکڑ لیا۔"

"سرکار یہ ایسے نہیں مانے گا اس نے کچھ دیر پہلے چھوٹی بیگم صاحبہ کا نام لیا تھا۔

"اچھا۔"یہ سن کر کنور صاحب کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

"پھر اسے رانی کے آگے ڈالو یہی اس سے سچ اگلوائے گی۔"

شیرنی کے آگے ڈالنے کا حکم سن کر اس کے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی، وہ گھبرا کر بولا ایسا نہ کریں.جی میں سچ بتائے دیتا ہوں۔

اور پھر اس نے جو سچ بتایا وہ چھوٹی بیگم کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔

فہد کوثر کا پڑوسی تھا، دونوں گھرانوں میں بہت اچھے تعلقات تھے۔بچپن ایک ساتھ کھیل کر گزرا جوانی میں قدم رکھا تو کھیلنے کی عادت پھر بھی نہ گئی بچپن اور جوانی کے کھیلوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ یہاں بھی تھا۔

محبت کا کھیل سب سے جدا ہوتا ہے اور جو لوگ یہ کھیل کھیلتے ہیں وہ دنیا کو بھول جاتے ہیں، دنیا کو کیا خود وہ اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں محبت وہ میٹھا زہر ہوتا ہے۔جو آہستہ آہستہ رگوں میں اترتا رہتا ہے اور پھر ایک دن بندہ اپنے آپ سے بھی چلا جاتا ہے مر جاتا اور جو مر جاتا ہے وہی محبت کو پاتا ہے فہد اور کوثر کے درمیان یہ کھیل گہرا بہت گہرا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہوکر دونوں نے شادی کا پروگرام طے کرر کھا تھا کہ اتنے میں کنور جہاں زیب نے اپنی ٹانگ اڑائی اور سنہرے خواب دیکھنے والی کوثر سونے می چلتی پھرتی کان کو دیکھ کر بت بن گئی۔ایک طرف مفلس جوانی تھی۔اور دوسری طرف زردار بڑھاپا۔اس نے آنکھ بند کرکے زردار بڑھاپے کا ہاتھ پکڑ لیا۔یہ سوچ کر کہ مفلس جوانی سے جسم کی لو بڑھائے گی اور زردار بڑھاپے سے خواہشوں کا محل تعمیر کرے گی اس نے نیک وقت اپنے ہاتھوں میں چاند اور سورج لینے کی تمنا کی تھی۔اور یہ تمنا کچھ عرصے تک پوری بھی ہوتی رہی کوثر مہینے میں ایک بار لاہور کا چکر ضرور لگالیتی اور اس چکر میں فہد اس کے بہت قریب ہوتا اب جو چھ مہینے سے فہد نے اس کی شکل نہ دیکھی تو وہ تڑپ گیا اور اسی نادانی میں عالم گڑھ آگیا۔اس کا خیال تھا کہ وہ

کسی نہ کسی طرح کوثر تک رسائی حاصل کرلے گا اسے کیا معلوم تھا کہ یہاں کالی حویلی کے چاروں طرف ایسا جال پھیلا ہوا ہے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

فہد کی زبانی محبت کی یہ رنگین کہانی سن کر کنور صاحب نے کسی غصے کا اظہار نہ کیا وہ بڑی سنجیدگی سے اس ذکر کو سنتے رہے جب فہد اپنے اور کوثر کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تو کنور صاحب نے ایک ٹھنڈی اور گہری سانس لی۔

"یعقوب۔" انہوں نے یعقوب کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔

فہد کی کہانی میں کیونکہ بار بار چھوٹی بیگم کا ذکر آ رہا تھا اس لیے یعقوب از خود پیچھے ہٹ گیا تھا تاکہ کنور اچھی طرح اسکی بات سن لیں اور اسکی وجہ سے شرمندگی محسوس نہ کریں۔

"جی سرکار۔" یعقوب نے قریب آتے ہوئے کہا۔

یعقوب اسے اپنے ساتھ لے جاؤ اسکا فیصلہ ہم کل کریں گے۔ اور ایسا کرو کہ ایک پیالہ تیار کرواؤ ہم حویلی کے اندر جا رہے ہیں تم چھوٹی بیگم کو ہمارے پاس بھیج دو۔" یہ کہہ کر کنور جہاں زیب کھڑے ہو گئے۔

یعقوب نے بندوق کی نال فہد کے سینے پر رکھی اور اسے اٹھنے کا اشارہ کیا فہد کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کہ وہ یعقوب کے ساتھ خاموشی سے چل دے۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ کہ اسکے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اگر اسے کچھ اندازہ ہوتا بھی تو وہ کیا کر لیتا۔ تقدیر نے اس کے لیے جو گڑھا کھود رکھا تھا اسے بھرنے والا کوئی نہ تھا۔

یعقوب نے حویلی سے نکل کر فہد کو دو ملازمین کے حوالے کیا ساتھ ہدایت دی

"اسکا فیصلہ کل ہو گا اسے اپنی تحویل میں حفاظت سے رکھو چاہو تو ہاتھ پیر باندھ دو جس طرح تم لوگ مناسب سمجھو کرو بہر حال صبح یہ صحیح سلامت چاہیے۔

فہد کو ملازمین کی تحویل میں دے کر وہ حویلی میں داخل ہوا اس نے ایک ملازمہ سے چاندی کا پیالہ منگوایا جو کبھی کبھی استعمال ہوتا تھا، یہ پیالہ چاندی کے روپوں سے بھرا شوکیس میں رکھا رہتا تھا، اس شوکیس میں سوائے اس پیالے کے اور کوئی چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی۔

تھوڑی دیر میں ملازمہ نے روپوں سے بھرا چاندی کا پیالہ یعقوب کے سامنے لا رکھا۔ یعقوب نے چاندی کے روپوں کو ملازمہ کے دوپٹے میں الٹ دیا اور پیالے کو ہاتھ میں لے کر اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"ان روپوں کا کیا کروں؟" ملازمہ نے یعقوب سے پوچھا۔

"انہیں شوکیس میں رکھ دو جب میں تمہیں پیالہ واپس دوں تو ان روپوں سے پھر اس کو بھر دینا، سمجھ گئیں۔"

"جی سمجھ گئی۔" ملازمہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعقوب صاحب ایک بات پوچھوں؟ آپ نے اس پیالے کو کیوں نکلوایا ہے کیا کریں گے آپ اس کا؟"

"خاموش بے وقوف عورت اپنے کام سے کام رکھ اس طرح زندگی اچھی گزر سکتی ہے جا بھاگ جا، یعقوب نے اسے جانے کا اشارہ کیا۔

وہ ملازمہ ڈری سہمی یعقوب کو عجیب نظروں سے دیکھتی فوراً وہاں سے غائب ہو گئی۔ ملازمہ کے جانے کے بعد اس نے حویلی کے تہہ خانے کا رخ کیا اور وہاں بیٹھ کر اس نے پورے اطمینان سے وہ پیالہ تیار کیا۔ پھر اس

پیالے کو اس نے کنور صاحب کے بیڈروم میں پہنچادیا۔یعقوب کے ہاتھ میں چاندی کا پیالہ دیکھ کر کنور صاحب بڑی سفاکی سے مسکرائے۔

"ادھر رکھ دو۔" کنور صاحب نے نزدیک پڑی ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔

یعقوب سرخ مشروب سے بھرے پیالے کو میز پر رکھ کر سیدھا ہوا تو کنور صاحب نے حکم دیا۔

"چھوٹی بیگم کو ہمارا پیغام دو۔"

"جی بہتر سرکار۔" یعقوب الٹے قدموں کمرے سے نکل گیا۔

کوثر کو قید ہوئے چھ ماہ گزر چکے تھے۔اب وہ اس قید تنہائی کی عادی ہو

کیا۔

پیالہ ختم ہوتے ہی وہ چکرا کر قالین پر گری اور فہد کی طرح تڑپنے لگی۔ کنور صاحب نے اس کے تڑپتے جسم پر نظریں گاڑ دیں۔ان کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ پھیلتی جا رہی تھی۔وہ اندر ہی اندر آسودہ ہوتے جا رہے تھے۔انتقام کی آگ سرد ہوتی جا رہی تھی۔

جب کوثر کا جسم تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا تو کنور صاحب نے یعقوب سے کہا۔یعقوب فہد کی لاش کہیں دور جنگل میں لے جا کر گاڑ دو اور اس ذلیل عورت کو اس کے گھر پہنچانا ہے۔ہمارے آبائی قبرستان میں ایسی عورتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔فہد کو ابھی ٹھکانے لگاؤ اور اسے صبح لے جانا۔

سرکار۔"اگر آپ اجازت دیں تو اسے بھی فہد کے ساتھ ٹھکانے لگا دوں۔"یعقوب نے ڈرتے ڈرتے رائے پیش کی۔

"نہیں جیسا تم سے کہا گیا ہے ویسا کرو۔مجھے حیل و حجت بالکل پسند نہیں۔" کنور صاحب نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

لہجے کی سختی محسوس کر کے یعقوب ایک دم سیدھا ہو گیا اور گھگیاتے ہوئے بولا "معافی چاہتا ہوں سرکار آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے،اب تم فوراً کام میں لگ جاؤ اور دیکھو اپنے ساتھ بھروسے کے لوگوں کو رکھنا اور ذرا احتیاط سے کام لینا۔"

آپ فکر نا کریں سرکار میں سب ٹھیک کر لوں گا۔

"میں دوسرے بیڈروم میں جا رہا ہوں۔لاہور جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا میں سعدیہ کے نام ایک خط دوں گا وہ اسے پہنچانا ہے۔" یہ کہہ کر وہ دونوں کی لاشوں پر نظر ڈالتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھے۔یعقوب نے لپک کر دروازہ کھولا اور وہ بڑے اطمینان سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو یا روز ہی ایسا ہوتا ہو۔

صبح کو وہ حسبِ معمول اپنی چہیتی گھوڑی پر سیر کو نکلے۔جب وہ واپس آئے تو یعقوب روانگی کے تمام انتظام مکمل کر چکا تھا۔اب وہ کنور صاحب کا منتظر تھا کہ وہ ناشتا کر لیں تو ان سے ملاقات کرے۔

ناشتے کے بعد خود ہی کنور صاحب نے اسے بلوالیا۔یعقوب کو پیغام بھیجنے کی ضرورت نہ پڑی۔ان سے مل کر اس نے ساری باتیں اچھی طرح سمجھ لیں۔پیسے لے لیے۔خط لے لیا اور پھر وہ اجازت لے کر حویلی سے نکل گیا۔

دونوں گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔وہ جیپ میں بیٹھ گیا،پیچھے وین میں تابوت تھا اور چار آدمی ساتھ تھے۔مستعد اور اسلحہ سے لیس جیپ میں بھی یعقوب کے علاوہ تین آدمی موجود تھے۔

دونوں گاڑیاں تیزی سے کالی حویلی کے مین گیٹ سے باہر نکلیں اور لاہور کی جانب گامزن ہو گئیں۔ راستے میں کسی قسم کی کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ بخیر وخوبی اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ کوثر کا گھر سمن آباد میں تھا۔ جب دونوں گاڑیاں گھر کے سامنے رکیں تو گلی میں سناٹا طاری تھا۔

یعقوب کے لیے یہ ایک مشکل وقت تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کوثر کی موت کی کس طرح اطلاع دے۔ وہ سارے راستے یہی سوچتا آیا تھا کہ یوں کال بیل بجائے گا اور جب دروازہ کھلے گا تو وہ یوں گویا ہوگا لیکن وہ ابھی تک کسی ایک جملے پر متفق نہ ہو سکا تھا۔ اسے کنور جہانزیب پر بھی غصہ تھا۔ انھوں نے خوامخواہ لاش پہنچانے کا چکر چلا دیا تھا۔ کنور صاحب بھی خوب آدمی تھے شائستہ بیگم کی وصیت کے باوجود انھوں نے ان کی لاش ان کے شہر نہ بھجوائی تھی اور چھوٹی بیگم نے جب کہ ایسی کوئی خواہش ظاہر بھی نہ کی تھی تو انھیں کنور صاحب نے ان کے گھر بھیج دیا تھا۔ کنور صاحب کی کوئی کل سیدھی نہ تھی، یہی وجہ تھی کہ یعقوب اتنا عرصہ ان کے ساتھ رہنے کے باوجود انہیں بالکل نہ سمجھ پایا تھا۔ وہ مسکرانے کی بات پر غصہ کرتے تھے اور بعض وقت غصے کی بات پر ہنس دیا کرتے تھے۔

گھر کے گیٹ پر پہنچ کر یعقوب نے کال بیل بجائی اور پیچھے ہٹ کر گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد گیٹ کے پیچھے سے آواز آئی۔ یہ کسی خاتون کی آواز تھی۔ غالباً وہ کوثر کی ماں تھیں۔

"ہم عالم گڑھ سے آئے ہیں جی۔" یعقوب نے گیٹ کے نزدیک پہنچ کر دھیرے سے کہا۔

عالم گڑھ کا نام سن کر گویا ادھر زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ کھٹا کھٹ گیٹ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی خاتون باہر نکل کر آئیں۔ آپ عالم گڑھ سے آئے ہیں۔ کنور جہانزیب کی حویلی سے؟

"جی ہاں۔" یعقوب نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا آپ چھوٹی بیگم کی امی ہیں؟"

ہاں میں کوثر کی ماں ہوں۔ کیسی ہے وہ؟ چھ مہینے ہو گئے اسے ادھر آئے ہوئے۔ آیئے آپ اندر آجایئے۔ آپ شائد یعقوب صاحب ہیں۔

جی میرا نام یعقوب ہے۔ میں جی ایک بری خبر لے کر آیا ہوں۔ چھوٹی بیگم ہمارے ساتھ آئی ہیں۔ آپ ذرا ہمت سے کام لیجئیے گا موت اور زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں۔۔۔۔۔۔۔

کیا ہوا میری بیٹی کو۔۔۔۔۔۔۔ کہاں ہے وہ؟۔ کوثر کی امی میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ پوری بات سن سکتیں وہ چیخ کر بولیں ارے بتاتے کیوں نہیں میری بیٹی کو کیا ہوا؟

"ہمارے ساتھ ان کی میت آئی ہے جی۔" یعقوب نے بڑا جی کڑا کر کے کہا۔

میت کا نام سن کر کوثر کی امی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ انہیں سکتہ ہو گیا اور پھر چند لمحے بعد انہیں چکر سا آیا اور وہ چکرا کر زمین پر آرہیں۔ کوثر کی امی کو کوثر کے بڑے بھائی نے سنبھالا جو گیٹ پر یہ دیکھنے آیا تھا کہ کون آیا ہے۔

گھر میں اس وقت ان دونوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ کوثر کے والد کہیں گئے ہوئے تھے۔ کوثر کے بھائی محمود نے بڑے حوصلے سے کام لیا۔ پہلے اس نے ماں کو اٹھا کر بیڈ روم میں پہنچایا پھر تابوت اتروا کر صحن میں رکھا۔ تابوت لانے والوں کو ڈرائینگ روم میں بٹھایا گیا اور یعقوب سے پوچھنے لگا یہ سب کیسے ہوا؟

ہوا یہ جی۔ یعقوب نے بتانا شروع کیا کہ چھوٹی بیگم کل شام کو حویلی کے باغ میں ٹہل رہی تھیں کہ جھاڑیوں میں سے ایک کالا ناگ نکل آیا۔ اس نے چھوٹی بیگم کو ڈس لیا۔ میں نے فوراً دو تین گاؤں سے کئی سپیروں کو بلوایا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہی چھوٹی بیگم اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مرنے سے پہلے انہوں نے دو باتوں کی وصیت کی۔ ایک تو انہوں نے یہ کہا کہ مجھے انتقال کے بعد لاہور روانہ کر دیا جائے دوسرے میرے والدین کو پانچ لاکھ روپے بجھوا دینا۔ کنور صاحب نے ان کی وصیت کے مطابق انھیں اوران کے

ساتھ پانچ لاکھ روپے بھیج دیے ہیں۔ وہ خود ساتھ آنا چاہ رہے تھے لیکن چھوٹی بیگم کی موت کے صدمے نے انہیں نڈھال کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ معذور ہو کر رہ گئے ہیں اس لیے وہ نہ آسکے انھوں نے مجھے بھیج دیا۔ یعقوب نے ساری روداد سنا کر بریف کیس اٹھا کر میز پر رکھا اور اسے کھولنے لگا۔

بریف کیس کھلا تو اس میں لال لال نئے نوٹوں کی گڈیاں نظر آئیں۔ ان نوٹوں سے پورا بریف کیس بھرا ہوا تھا۔

"آپ پیسے چیک کر لیں جی۔" یعقوب نے محمود سے کہا۔

"ارے کمال کرتے ہیں آپ بس اسے بند کر دیجئیے۔"

یعقوب نے بریف کیس بند کر کے اس کی چابی محمود کے حوالے کی۔ محمود نے بریف کیس اٹھایا اور اسے لے کر اندر چلا گیا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا اوپر اپنے اسٹور نما کمرے میں پہنچا اور بریف کیس کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور پھر ڈرائینگ روم میں واپس آگیا۔

کوثر کی میت آنے کی اطلاع فوراً ہی آس پاس کے گھروں میں پہنچ گئی۔ عورتیں آنے لگیں، مرد جمع ہونے لگے تب یعقوب وہاں سے یہ کہہ کر نکل آیا ہم ذرا ایک کام سے گلبرگ جا رہے ہیں دو ڈھائی گھنٹے میں واپس آتے ہیں تب تک تدفین کی تیاری مکمل ہو چکی ہو گی۔ ہم آکر جنازے میں شریک ہو جائیں گے۔

"جی ٹھیک ہے۔" محمود گیٹ تک یعقوب کو چھوڑنے آیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک دونوں گاڑیاں گلی سے نہ نکل گئیں۔

گاڑیوں کے چلے جانے کے بعد اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ سوچتا ہوا اندر چلا گیا۔ محمود حال ہی میں کراچی سے آیا تھا وہ ایک جرائم پیشہ لڑکا تھا۔ گریجویٹ ہونے کے باوجود منفی رجحان کا مالک تھا۔ اسے بہن کی موت کا اتنا غم نہ ہوا تھا جتنی خوشی اسے پانچ لاکھ روپے ملنے کی تھی۔ یہ پانچ لاکھ اب اس کے تھے۔ اسے کیا

ضرورت تھی کہ وہ گھر والوں سے ان روپوں کا ذکر کرے۔ کراچی میں وہ کئی بنک ڈکیتیوں میں ملوث تھا۔ اس کا چار پانچ لڑکوں پر مشتمل ایک گروہ تھا۔ کراچی میں ان دنوں پکڑ دھکڑ زیادہ ہو رہی تھی اس لیے محمود ادھر بھاگ آیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو بھی کراچی چھوڑنے کا مشورہ دیا۔ پروگرام یہ تھا کہ کچھ آرام کر کے پھر نئے سرے سے واردات کا سلسلہ شروع کریں گے۔

یعقوب کوثر کی میت پہنچا کر سیدھا گلبرگ پہنچا۔ اسے سعدیہ کو کنور صاحب کا خط دینا تھا اور زبانی حالات بتانے تھے۔

سعدیہ اتنے عرصے بعد یعقوب کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ یعقوب اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا اور خالی خالی نظروں سے سعدیہ کو دیکھ رہا تھا۔

"یعقوب صاحب تشریف رکھیے"۔ اس نے صوفے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کی آمد کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟"

نہیں چھوٹی سرکار! آپ کا نمک خوار ہوں۔ میں تو بڑے سرکار کا خط لے کر آیا ہوں۔

آپ بابا جان کا خط لائے ہیں۔ انھوں نے مجھے خط لکھا ہے۔ کیسے ہیں میرے بابا جان۔ خط کا ذکر سن کر وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ لائیے دیجیے کہاں ہے خط؟

یعقوب نے جلدی سے اپنی جیکٹ کی جیب سے خط نکال کر سعدیہ کو ادب سے پیش کیا اور پھر صوفے پر بیٹھ گیا۔

سعدیہ نے بڑی بے قراری سے لفافہ چاک کیا اور خط پڑھنے لگی۔

سعدیہ بیٹے؟

میں نے وہ دیوار گرا دی ہے جو ہمارے درمیان حائل ہو گئی تھی۔ یعقوب تمہیں زبانی سب کچھ بتا دے گا اس

سے پوچھ لینا۔اب آکر مجھ سے مل جاؤ تمہارا چہرہ دیکھے ایک عرصہ گزر گیا ہے۔

تمہارا منتظر کنور جہاں زیب۔

خط پڑھ کر سعدیہ کو بہت خوشی ہوئی۔اس کی آنکھیں ایک دم چمک اٹھیں۔وہ مسکراتے ہوئے بولی۔کوثر کو کیا ہوا یعقوب صاحب؟ کیا بابا جان نے اسے طلاق دے دی؟

چھوٹی سرکار،وہ عورت اس حویلی کے قابل نہ تھی۔اس نے بڑے سرکار کو بڑا دکھ دیا۔یعقوب نے تمہید اٹھائی۔

ہاں میں جانتی ہوں کہ وہ کس قابل تھی۔پر بابا جان کو کیا کہوں انھوں نے اس قدر رازداری برتی کہ میں کچھ نہ کر سکی۔خیر پچھلی باتوں کا اب ذکر کیا۔آپ بتائیں کہ اس نے کیا کیا۔

وہ جی یہاں آکر ایک لڑکے سے ملتی تھی۔اس لڑکے کا نام فہد تھا جی۔جب پچھلے چھ ماہ سے وہ لاہور نہ آسکی تو وہ لڑکا اس سے ملنے حویلی پہنچ گیا۔وہاں ہم لوگوں نے اسے مشکوک حالت میں گھومتے ہوئے پکڑ لیا اور بڑے سرکار کی خدمت میں پیش کر دیا۔وہاں اس لڑکے نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔بس جی پھر بڑے صاحب کو طیش آگیا لہٰذا نہ وہ لڑکا فہد رہا اور نہ چھوٹی بیگم کوثر۔یعقوب نے مختصر سی روداد سنائی۔

اوہ! سعدیہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

میں اس وقت کوثر کی میت اس کے گھر پہنچا کر آیا ہوں۔فہد کو ہم نے وہیں جنگل میں دبا دیا ہے۔چھوٹی سرکار یہ راز کی بات ہے راز ہی رکھیے گا۔یعقوب نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔

میں جانتی ہوں یعقوب صاحب سب سمجھتی ہوں۔

پھر آپ ہمارے ساتھ چلیں گی؟

نہیں میں دو چار دن بعد آؤں گی۔میرے ٹیسٹ وغیرہ ہو رہے ہیں۔سعدیہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

ویسے اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ابھی ان لوگوں کے ساتھ چلی جائے لیکن وہ ایاز کو بتائے بغیر نہیں جانا چاہتی تھی۔ایاز یہ سب سنے گا تو بہت خوش ہو گا۔وہ اکثر اسے زور دیا کرتا تھا کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا اب وہ باپ سے ملنے چلی جائے مگر وہ ہمیشہ بڑی سختی سے انکار کر دیتی تھی کہ کوثر کی موجودگی میں وہ کبھی حویلی میں نہیں جائے گی۔

ایاز سے اس کی ملاقات کالجوں کے ایک انعامی مباحثے میں ہوئی تھی۔وہ مباحثہ اگرچہ سعدیہ نے جیت لیا تھا لیکن وہ ایاز کو دل ہار بیٹھی تھی۔ایاز بظاہر ایک عام سا سیدھا سادہ لڑکا تھا لیکن اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ آدمی کا دل اس کی طرف خود بخود کھنچتا تھا۔شائد اس کے اندر کوئی مقناطیس لگا ہوا تھا۔اس کی شخصیت میں انفرادیت تھی،سنجیدگی تھی،بردباری تھی اور اس کی مسکراہٹ میں بڑی کشش تھی۔

کہ وہ کس کا بیٹا ہے تا کہ یہ سن کر کل جو صدمہ ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے۔

اور جب ایاز نے اپنے والد کا نام بتایا تو اس نے اس نام کو بہت بے پروائی سے سنا اور مسکرا کر بولی مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم کس کے بیٹے ہو۔میں تم سے شادی تمہارے حوالے سے کرنا چاہتی ہوں۔تم مجھے پسند ہو۔مجھے اچھے لگتے ہو بس اتنا ہی میرے لیے کافی ہے لیکن میں جانتی ہوں کہ میرے بابا جان اس طرح نہیں سوچیں گے۔وہ اپنے ملازم یعقوب کے بیٹے سے ہرگز شادی نہیں کریں گے بلکہ اس طرح کی بات سن کر شعلے کی طرح بھڑک اٹھیں گے تو بھڑک اٹھیں۔وہ اپنے ملازم کے بیٹے کو اپنا داماد بنانا پسند نہیں کریں گے تو نہ کریں میں جو تمہارے ساتھ ہوں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ مجھے عاق کر دیں گے۔جائیداد سے محروم کر دیں گے تو کر دیں۔کیوں ٹھیک ہے نا۔تمھیں جائیداد سے تو کوئی دلچسپی نہیں؟

نہیں بالکل نہیں ایاز نے بڑے یقین سے کہا اور اس یقین میں بڑی سچائی تھی۔

بس اب تم فکر ہی نا کرو آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ابھی تم اپنی تعلیم پر توجہ دو کہ اسی پر ہمارے مستقبل کا

انحصار ہے۔

سعدیہ کی یہ بات سن کر اسے بڑا اطمینان ہوا۔ وہ پہلے مرحلے سے بخیر وخوبی گزر گیا تھا اب دوسرے اور آخری مرحلے سے گزرنا باقی تھا اور اس کی اسے کوئی خاص فکر نہ رہی تھی۔ سعدیہ جو اس کے ساتھ تھی۔

یعقوب کافی دیر بیٹھا سعدیہ سے باتیں کرتا رہا اسے حویلی کے قصے سناتا رہا۔ رانی کا بھی کئی بار ذکر آیا۔ اس شیرنی سے سعدیہ کو بھی بڑی دلچسپی تھی وہ بڑے شوق سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس طرح کی باتیں کر کے اور سعدیہ سے حویلی آنے کا پکا وعدہ لے کر یعقوب اٹھ کھڑا ہوا۔

اچھا چھوٹی سرکار اب ہمیں اجازت۔ اس نے بندوق کو شانے سے لٹکاتے ہوئے کہا آپ آنے میں دیر مت کیجئیے گا۔

نہیں یعقوب صاحب ایسا نہیں ہوگا، میں باباجان سے ملنے کے لیے خود بے قرار ہوں۔

خداحافظ۔ سعدیہ اسے چھوڑنے گیٹ تک آئی معاً اسے خیال آیا کہ وہ یعقوب سے کہے کہ آپ اپنے بیٹے ایاز سے نہیں ملیں گے کیا لیکن پھر فوراً ہی اس نے خود کو سنبھال لیا۔

ایسی بات کر کے وہ خود کو الجھن میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی نہ ہی وہ یعقوب کو کسی عذاب میں مبتلا کرنا چاہتی تھی۔ ابھی یہ بات راز تھی تو اسے راز ہی رہنا چاہیئے تھا۔

دوسرے دن جب سعدیہ کی ایاز سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی اور خوش کیوں نہ ہوتی آخر اس کے درمیان حائل وہ دیوار گر گئی تھی جس نے باباجان کو اس سے دور کر دیا تھا۔ باباجان سے ملاقات ہو گئی تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنے دل کی بات ان تک پہنچائے گی۔ یہی سوچ سوچ کر وہ خوش ہو رہی تھی۔

کیا ہوا بھئی، کچھ بتاؤ تو آج تم ضرورت سے زیادہ خوش ہو بالآخر ایاز سے نہ رہا گیا تو اس نے پوچھا۔

ایاز کو ٹر مر گئی۔

ارے کیسے؟

اسے سانپ نے ڈس لیا۔

بالآخر وہ اپنے کیے کو پہنچی۔ ایاز نے گہرا سانس لیا۔

ہاں کل تمہارے والد آئے تھے باباجان کا خط لے کر۔ کیا وہ تم سے نہیں ملے؟

ہاں آئے تھے وہ مجھ سے ملنے ایاز نے بتایا۔

پھر انھوں نے تم کو کچھ نہیں بتایا؟ سعدیہ نے پوچھا۔

نہیں بس اتنا کہا کہ وہ کسی کام سے لاہور آئے تھے تو مجھ سے بھی ملنے آ گئے۔ وہ بہت وفادار قسم کے آدمی ہیں حویلی کی باتیں وہ ہر ایک سے نہیں کرتے، ایاز نے کہا۔

تب ہی تو وہ باباجان کے دستِ راست ہیں۔ میرا خیال ہے شاید ہی حویلی کی کوئی بات ہو جو یعقوب صاحب کو معلوم نہ ہو۔ سعدیہ نے اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کل رات میں تمہارا ذکر کرنے لگی تھی بس تمہارا نام زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

اس کا مطلب ہے کہ محبت میں وہ مقام آتے آتے رہ گیا کہ کسی کا نام لوں لب پر تمہارا نام آئے۔

یہ مقام تو کب کا آ چکا اب تو ہر وقت تمہارا نام ہی نوکِ زبان پر رہتا ہے۔ تمہاری ہی تصویر دل میں جگمگاتی رہتی ہے۔ سعدیہ نے بڑے پیار سے کہا۔

آج تو بڑے موڈ میں ہو اللہ رحم کرے۔

رحم کس پر کرے؟

ہم دونوں پر۔ ایاز نے مسکراتے ہوئے کہا اور خدا کرے کہ یہ موڈ تمہارا ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے۔ میں نے تمہیں بہت دنوں بعد خوش دیکھا ہے۔ میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم سے بہت محبت ہے۔

میں توجواب میں ایسا کہنے سے رہی۔ سعدیہ نے جھکی جھکی نظروں سے کہا۔

کیاایسا کہنے سے رہی۔

یہی ابھی تم نے جو کہا۔

کیا کہا؟

مجھے تم سے محبت ہے۔ سعدیہ نے بڑی معصومیت سے کہا۔

یہ سن کر ایاز نے زور سے قہقہ لگایااور پھر بولا۔ واقعی؟

چلوہٹو۔ میں تم سے بات نہیں کرتی۔

میں نے کیا کہا۔

تم مجھے ہمیشہ بات کرتے کرتے بھٹکادیتے ہو۔ میں بات کیا کر رہی تھی اور شروع کروادی کیا۔

اچھایہ بتاؤ کنور صاحب نے خط میں کیا لکھا ہے۔

مجھے بلایا ہے۔ سعدیہ نے کہاوہ تو مجھے اپنے ساتھ ہی لے جاناچاہ رہے تھے مگر میں تم سے ملے بغیر کیسے چلی جاتی لہٰذامیں نے بہانہ کر دیا۔

پھراب کیاارادہ ہے؟

کل جاؤں گی۔

یہ چھوٹی سرکار وہاں جاکر ہمیں بھول تو نہ جائے گی۔

کیا کہہ سکتی ہوں ابھی بچھڑی نہیں ناتم سے بچھڑوں گی توپتا چلے گا۔

خوابوں میں تو ملو گی۔

نہیں۔

آخر کیوں۔

ہم حقیقت میں جو ملیں گے۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔

ہاں ایسا ہی ہو گا۔ یہ میرا یقین ہے۔

کل جاؤ گی تو واپسی کب ہو گی؟

دو چار دن تو لگیں گے کم از کم۔

تب تک میں کیا کروں گا؟

کوئی اور سعدیہ ڈھونڈ لینا۔ تم مردوں کے لیے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ سعدیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ اسی طرح ☆☆ کیا کرتی تھی۔

اچھازیادہ بکواس نہ کروایاز نے جوابی کاروائی کی جس طرح عورت اپنی پہلی محبت نہیں بھولتی ویسے ہی مرد اپنی آخری محبت نہیں بھولتا۔

تو میں تمھاری آخری محبت ہوں۔ اس سے پہلے آپ اور کہاں کہاں یہ گل کھلا چکے ہیں۔

تم نے میری پوری بات نہیں سنی نا، میں یہ عرض کرنا چاہ رہا تھا کہ آخری کے ساتھ پہلی بھی ہو۔

اگر میں تمھاری پہلی اور آخری محبت ہوں پھر تو ایاز تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ زندگی گنوادی ایسے ہی۔ ارے بندہ دو چار عشق تو کرے زندگی میں۔

اچھا زیادہ فضول باتیں نہیں ایاز نے ہنستے ہوئے کہا۔

ورنہ شرما جاؤ گے۔

ماشاءاللہ آج تو بڑی تیز جارہی ہو۔

اچھا اب مذاق چھوڑو۔ آؤ کچھ سنجیدگی سے باتیں کریں۔ مجھے کچھ مشورہ دو ابا جان سے میں کس طرح بات کروں؟

پھر وہ دونوں بڑی دیر تک سر جوڑے آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ کس طرح بات کرنا ہے؟ بات کا کیا نتیجہ نکلنا ہے اور اس نتیجے کو کس طرح قبول کرنا ہے؟

دوسرے دن جب وہ حویلی میں پہنچی تو کنور جہاں زیب باغ میں بیٹھے شغل فرما رہے تھے۔ قریب ہی گھاس پر رانی بیٹھی تھی۔

تب یعقوب نے آکر اطلاع دی۔ چھوٹی سرکار آگئی ہیں۔

ٹھیک ہے میں اندر حویلی میں چلتا ہوں تم میز سے یہ چیزیں ہٹوا دو۔

کنور صاحب کے جانے کے بعد یعقوب نے ایک ملازم کو آواز دی۔

جی صاحب۔ وہ دوڑا ہوا آیا۔

یہ بوتلیں اور گلاس بہت احتیاط سے بڑے سرکار کے کمرے میں پہنچاؤ۔

یعقوب نے ملازم کو ہدایت دی اور ہلاکت خان سے کہو کہ وہ رانی کو اپنے ٹھکانے پر لے جائے۔

جی ٹھیک ہے صاحب۔

یعقوب پھر وہاں ایک لمحے بھی نہ رکا۔ وہ تیزی سے حویلی کی طرف گیا۔ ابھی اسے کئی کام کرنے تھے۔

ادھر سعدیہ اپنے کمرے میں یعقوب کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی تاکہ معلوم ہو کہ کنور جہاں زیب اس وقت کہاں ہیں وہ فوراً اسے بلواتے ہیں یا اسے کچھ انتظار کرنا ہوگا۔

اس بے چینی بے قراری میں بار بار اس کی نظریں دروازے پر اٹھ رہی تھیں کہ اچانک کنور جہاں زیب دروازے پر نمودار ہوئے اور وہ وہیں رک گئے۔ سعدیہ نے کنور صاحب کو کمرے کے دروازے پر دیکھا تو

خوشی سے دیوانی ہو گئی۔

بابا جان۔ یہ کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اپنے باپ سے لپٹ گئی۔

میری بیٹی۔ کنور صاحب نے سعدیہ کی پیشانی کو چوما اور اسے بازو میں لیے کمرے میں داخل ہوئے۔ کیسی ہے میری سعدیہ؟

آپ کی سعدیہ بالکل ٹھیک ہے بابا جان۔ سعدیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب تو ناراض نہیں۔

بس بابا جان۔ اب آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ سعدیہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کنور صاحب نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ سعدیہ ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔ وہ اسے بھیانک خواب سمجھ کر بھول جانا چاہتی تھی۔ کنور صاحب کو بھی کوثر کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ انھیں جو عذاب دے گئی تھی اسے یادِ ماضی کی طرح بھول جانا چاہتے تھے۔

یہ کوئی حادثہ سا حادثہ تھا، کوئی توہین سی توہین تھی، کوئی ذلت سی ذلت تھی۔ اگرچہ انھوں نے اس ذلت کا بھرپور طریقے سے انتقام لیا تھا پھر بھی فہد کا خیال آتے ہی ان کے تن بدن میں آگ بھڑک اٹھتی تھی۔ سعدیہ مشکل سے دو تین دن حویلی میں رہی پھر اس نے لاہور جانے کی اجازت چاہی۔ ان دو تین دنوں میں ایاز سے دوری اس کے لیے بڑی جان لیوا ثابت ہوئی۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ ایاز کے بغیر یہ دنیا بے کار ہے۔

کنور صاحب کو اگرچہ پوری طرح تو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ ان کی بیٹی کسی کی محبت میں گرفتار ہے البتہ انھوں نے اسے کچھ الجھا الجھا کچھ کھویا کھویا ضرور محسوس کیا۔

سعدیہ کے لاہور روانہ ہونے کے بعد انھوں نے یعقوب کو بلوا لیا اور بڑی رازداری سے بولے یعقوب جال لگانا

ہو گا۔

لگ جائے گا سرکار آپ حکم کریں کہاں ؟

سعدیہ پر۔ کنور جہاں زیب نے بڑی سنجیدگی سے بتایا۔

چھوٹی سرکار! یعقوب نے تصدیق چاہی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا ہو۔ سرکار یہی فرمایا نا آپ نے ؟

یعقوب میں بات کو بار بار دہرانے کا عادی نہیں ہوں۔ تم اپنے کان ذرا کھلے رکھو۔ کنور صاحب کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ یعقوب تمھیں خود لاہور جانا ہو گا۔ اپنے ساتھ دو تین ہوشیار بندے لے جانا سمجھ گئے۔

جی سمجھ گیا سرکار۔ آپ فکر نہ کریں کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔ یعقوب نے بڑے اعتماد سے کہا۔

بس پھر تم لاہور جانے کی تیاری کرو مجھے امید ہے کہ تین چار دن میں تم لوٹ کر واپس آجاؤ گے اور تمھارے پاس مجھے سنانے کو بہت کچھ ہو گا۔

یعقوب نے حکم کی تعمیل میں فوراً لاہور کے لیے رختِ سفر باندھا۔ اپنے ساتھ تین چار معتبر آدمی لیے اور کچھ ضروری سامان لیا کچھ کنور جہاں زیب سے ہدایات لیں اور سعدیہ جس کوٹھی میں رہائش پزیر تھی وہاں جال لگا دیا۔

یہ جال دراصل سعدیہ کی خفیہ نگرانی کے لیے تھا۔ کنور صاحب کی ہدایت اور حکم کے مطابق سعدیہ کی نگرانی کا جال بڑی مہارت سے پھیلایا گیا تھا۔

گھر سے کالج، کالج سے گھر یا ہوٹل پھر واپسی پر کون ملنے آیا اور کتنی دیر بیٹھا۔ پھر شام کو سعدیہ کہاں گئی۔ کن لوگوں سے ملی۔ کس کے ساتھ شام گزاری اور پھر کب گھر واپس لوٹی۔ گھر میں کیا ہوتا رہا کب سوئی ؟

یعقوب کو پہلے ہی دن وہ خبر ہاتھ آگئی جس کے کنور صاحب منتظر تھے۔ لیکن یہ خبر بہت خوفناک تھی۔ یعقوب

اس خبر کو کنور صاحب تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ وہ کیا منہ لے کر کنور صاحب کے پاس جاتا اور انھیں کیسے بتاتا کہ بڑے سرکار! آپ نے مجھ سے جو جال لگوایا تھا اس میں خود میرا بیٹا بھی پھنس گیا ہے اب میں کیا کروں ؟ کس طرح آپ تک یہ بات پہنچاؤں۔۔۔ ؟

لیکن اسے آیا بہت غصہ۔ ایاز اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ سراسر خودکشی کے راستے پر گامزن تھا۔ کنور صاحب جب یہ سنیں گے تو ان کے سامنے اس کی کیا عزت رہ جائے گی۔۔۔ وہ یہی سوچیں گے کہ یعقوب نے جائیداد ہتھیانے کے لیے یہ نمک حرامی کی ہے۔

یعقوب نے اپنے بیٹے ایاز کو ساری اونچ نیچ سمجھائی اور اسے بتایا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے وہ ہرگز نہ ہو سکے گا۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو یا شائد دونوں ہی کو اس حرص وہوس کی نگرانی سے آزاد کر دیا جائے۔

بیٹا تم نے ایسا کیوں کیا، کیا سوچ کر کیا؟ یعقوب نے جھنجھلا کر کہا۔

ابا میں نے کسی منصوبہ بندی کے تحت ایسا نہیں کیا مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا کہ یہ کنور صاحب کی بیٹی ہے۔ جب معلوم ہوا تو میرے ہاتھ سے وقت نکل چکا تھا پھر بھی میں نے اپنے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا تا کہ وہ دھوکے میں نہ رہے اور کل علیحدہ ہونے سے بہتر ہے آج ہی الگ ہو جائے۔ لیکن ابا اس نے میری کسی بات کو سنجیدہ نہ لیا۔ جیسے اس کے نزدیک یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ ابا وہ بہت سیدھی اور سچی لڑکی ہے۔ ایسی لڑکی کے لیے جان بھی دی جا سکتی ہے۔ اور اب میں آپ کو سچ بتا دوں کہ میں اس کے لیے جان پر کھیل جاؤں گا مگر اسے تنہا نہ چھوڑوں گا۔

بیٹا تو اکیلا نہیں مارا جائے گا ساتھ میں میں بھی ہوں گا یہ یاد رکھ۔ یعقوب نے سنجیدگی سے کہا۔

لیکن اس میں آپ کا کیا قصور ؟

جابر کا کام جبر کرنا ہوتا ہے یہ دیکھنا نہیں کہ کون قصوروار ہے اور کون بے گناہ۔ لیکن اس وقت کنور صاحب کو جابر نہیں منصف بننا ہوگا۔ انھیں انصاف کرنا ہوگا کیوں کہ ایک طرف ان کے وفادار ملازم کی اولاد ہے تو دوسری طرف ان کی اپنی اولاد اور دونوں میں بٹنے یا ٹوٹنے والا کوئی نہیں۔

اس بات کے بعد اب کون سی بات رہ گئی تھی جو یعقوب اس سے کرتا۔ لاہور سے چلتے ہوئے اس نے پہلی اور آخری بار اس موضوع پر سعدیہ سے بھی بات کی۔

انکل! وہ یعقوب سے مخاطب ہو کر بولی۔ مجھے باباجان کی ذرہ برابر پرواہ نہیں اگر پرواہ ہے تو صرف ایاز کی وہ زیادہ سے زیادہ یہی تو کر سکتے ہیں کہ اپنی جائیداد سے مجھے محروم کر دیں تو وہ ویسا کر دیں۔ انھوں نے پوری زندگی خواہشوں کی غلامی میں گزار دی ہے۔ اگر میں پوری زندگی میں ایک دفعہ اپنی خواہش کی تابع ہو جاؤں گی تو کیا گناہ کروں گی۔۔۔۔ بولیں انکل۔

اس بات کے بعد اب کون سی بات رہ گئی تھی جو یعقوب اس سے کرتا لہٰذا اس نے بڑی خاموشی سے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر خود بھی لاہور چھوڑ دیا۔

ان تین چار دنوں میں جب یعقوب حویلی میں نہ تھا کنور صاحب کے حکم کی تعمیل میں لاہور گیا ہوا تھا تو کنور صاحب پر جانے کیا کیا بیت گئی۔ وہ واپس آیا تو اس نے کنور صاحب کو عجیب عالم میں دیکھا۔ وہ کانپتا لرزتا حویلی میں داخل ہوا تھا لیکن کنور صاحب کی حالت دیکھ کر اسے کچھ اطمینان سا ہوا۔

کنور صاحب چار شرعی بیویوں کے شوہر رہ چکے تھے ان کے علاوہ بھی انھوں نے ان گنت عورتیں دیکھی تھیں۔ انھوں نے زندگی میں جو چاہا وہ حاصل کر لیا تھا سوائے جائیداد کے وارث کے۔ وارث کے معاملے میں وہ کتنے بے بس تھے۔ اس کا اندازہ انھیں اچھی طرح تھا۔ اللہ کے آگے کس کی پیش چلی ہے وہ اگر نہ چاہے تو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا اور دینا چاہے تو اسے کوئی نہیں روک سکتا۔

کنور صاحب کی چوروں بیویاں ایک ایک کر کے اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ اس محل نما حویلی میں اب ہو کا عالم تھا۔ بیٹی بھی دو تین دن رہ کر لاہور چلی گئی تھی۔ اس کے آنے سے جو تھوڑی بہت رونق حویلی پر آئی تھی وہ اس کے جاتے ہی چلی گئی۔

ایک رات سوتے سوتے کنور صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ دل پر عجیب بے چینی بے قراری طاری تھی۔ انھوں نے گھڑی میں وقت دیکھا تین بجے تھے وہ ذرا اونچے ہو کر بیڈ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور چھت میں لٹکے جھلملاتے فانوس کو غور سے دیکھنے لگے۔ انھیں اندھیرے میں کبھی نیند نہیں آتی تھی لہٰذا یہ فانوس رات بھر روشن رہتا تھا۔

لیکن باہر کی روشنیوں سے بھی کبھی دل کا اندھیرا دور ہوا ہے۔ دل میں روشنی تو محبت سے پیدا ہوتی ہے ان نیکیوں سے ہوتی ہے جو کر کے دریا میں ڈال دی جاتی ہیں۔ کنور صاحب نے نیکی کرنا سیکھا ہی نہ تھا انھوں نے تو جو☆ ستم کرنا سیکھا تھا اور اسی کو زندگی کا شعار بنا لیا تھا۔ اس رات وہ سارے مظلوم ایک ایک کر کے ان کے سامنے آ رہے تھے اور ان کی پیشانی عرق آلودہ ہوتی جا رہی تھی۔ ان کی پوری زندگی گناہوں سے بھری تھی۔۔۔۔ اندھیروں سے بھرتی تھی اب اندھیرے ان کے من کے اندر اترے ہوئے تھے۔ بے قراری اور بے چینی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ اب تک قریب ہی میز پر رکھا ہوا پانی سے بھرا جگ کئی گلاسوں کی صورت میں پی چکے تھے لیکن گلے کی خشکی دور ہی نہ ہوتی تھی۔ ان کے کردہ گناہ حلق میں کانٹے بن کر چبھ رہے تھے مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ جی چاہتا تھا کہ انھیں کوڑا نکالیں اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود پر برسانے لگیں۔

سوچتے سوچتے فجر کا وقت ہو گیا۔ ان کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی۔ یہ کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ شاید آج ہوا کا رخ حویلی کی طرف تھا یہ اذان ان کے عطا کردہ لاؤڈ اسپیکر سے آ رہی تھی۔ یہ وہی

لاؤڈا سپیکر تھا جسے بخشتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

مولوی جی اس کا رخ حویلی کی طرف نہ ہو۔

آج اسی لاؤڈا سپیکر سے بڑی دھیمی دھیمی اذان کی آواز آرہی تھی اور ان کا جی چاہ رہا تھا کہ یہ آواز کسی طرح تیز ہو جائے تاکہ وہ پورے سکون کے ساتھ اسے سن سکیں۔

اذان ختم ہوئی تو وہ لمحہ آپہنچا جو ہدایت سے پُر ہوتا ہے۔ جو روشنی سے بھرا ہوتا ہے اور اس لمحے انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ اس وقت کنور صاحب کے دل میں بے اختیار نماز پڑھنے کی خواہش جاگی اور یہ خواہش اتنی تیز تھی کہ انھیں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی کھینچ کر باتھ روم کی طرف لے جارہا ہو۔ کہتا ہو چلو وضو کرو۔

کنور صاحب کو یاد نہیں تھا کہ پچھلی نماز انھوں نے کب پڑھی تھی؟ شاید بچپن میں پڑھی ہو کیوں کہ جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا یعنی جوان ہوئے تھے انھوں نے کبھی نماز نہ پڑھی تھی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے تو آنکھوں سے ندامت کا چشمہ جاری ہو گیا۔ جسم پر لرزہ طاری تھا اور آنسو تھے کہ روکے نہ رک رہے تھے۔ آنسو کے ہر قطرے کے ساتھ گناہ بہہ رہے تھے۔ ظلم پگھل رہے تھے اور ان کے اندر سے ایک نیا انسان نمودار ہو رہا تھا۔

اور جب یعقوب لاہور سے واپس آیا تو اسے وہ پرانے کنور صاحب کہیں نظر نہ آئے جو ذرا سی بات پر انسان کی زندگی چھین لیا کرتے تھے۔ اسے زندہ در گور کر دیتے تھے اور کبھی پشیمان نہ ہوتے تھے آج وہی کنور صاحب عصر کی نماز سے فارغ ہو کر باغ میں بیٹھے کوئی دینی کتاب پڑھ رہے تھے۔ رانی حسبِ معمول ان کے قدموں میں بیٹھی تھی وہ گاہے گاہے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ اس میز پر جس پر اس وقت جام و مینا کو ہونا چاہئیے تھا خالی پڑی تھی انھوں نے شراب پینے سے توبہ کر لی تھی۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اسے کنور صاحب کے بارے میں ساری تفصیل معلوم ہو گئی۔ یہ سب سن کر اسے

بہت خوشی ہوئی۔

کتاب پڑھتے پڑھتے جب کنور صاحب نے سر اٹھایا تو سامنے یعقوب کو کھڑا پایا۔ ارے یعقوب کب آئے تم؟ کنور صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔

یعقوب کی پہلی مرتبہ شکل دکھائی دی اور ظاہر ہے یعقوب کی آمد خالی از علت نہ تھی چھوٹی بیگم نے جلدی جلدی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھے اور کسی قدر ناراضگی سے بولیں یعقوب تم نے ہمارے ساتھ اچھا نہیں کیا، ہمارے منع کرنے کو باوجود تم نے کنور صاحب کو سب کچھ بتا دیا۔

چھوٹی بیگم صاحبہ ! میں سرکار کا نمک خوار ہوں، میں ان سے کوئی چیز نہیں چھپا سکتا اور اس وقت میں آپ کے لئے ایک خوشخبری لے کر آیا ہوں۔

خوشخبری۔ چھوٹی بیگم نے فوراً اپنا دل سنبھال لیا، جلدی سناؤ یعقوب جلدی سناؤ۔ سرکار نے آپ کو یاد کیا ہے وہ اس وقت اپنے بیڈ روم میں ہیں، آپ وہاں جلد از جلد پہنچ جایئے، اچھا اب میں چلتا ہوں۔ یعقوب سنو تو، چھوٹی بیگم نے تڑپ کر کہا۔

جی وہ جاتے جاتے رک گیا۔

کیا کنور صاحب نے ہمیں معاف کر دیا ہے۔

اس کا جواب آپ کو سرکار ہی دے سکتے ہیں۔

تم نے ان کے موڈ سے کچھ اندازہ لگایا۔

ان کے موڈ سے کچھ اندازہ لگانا بہت مشکل ہے بیگم صاحبہ، جب وہ مسکرا رہے ہوں تو ضروری نہیں کہ اندر سے بھی مسکرا رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے انہیں اندر ہی اندر غصہ آ رہا ہو یا جب ان کی پیشانی پر شکنیں پڑی ہوں تو ضروری نہیں کہ وہ ناراض ہی ہوں، وہ اندر سے خوش بھی ہو سکتے ہوں۔ یعقوب نے اپنے مالک کی شخصیت کا تجزیہ پیش کیا۔

تم ٹھیک کہتے ہو یعقوب، ! واقعی ان کا چہرہ دیکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ تم جاؤ میں ذرا تیار ہو کر آتی ہوں، چھوٹی بیگم نے کہا۔

جی بہتر۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے نکل گیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد جب چھوٹی بیگم جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلیں تو انہوں نے حویلی کے تمام دروازے کھلے پائے، دروازوں کو کھلا دیکھ کر ان کے دل میں خوشی کی لہر اٹھی، شاید کنور صاحب نے انہیں معاف کر دیا ہے، شاید پھر سے بہار کے دن آ گئے ہیں۔

جب چھوٹی بیگم بیڈ روم میں داخل ہوئیں تو انہوں نے کنور صاحب کو بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھے دیکھا، چند لمحوں کے لئے چھوٹی بیگم کھلے دروازے کی چوکھٹ پر رکیں انہوں نے پر شوق نگاہوں سے کنور صاحب کی طرف دیکھا، کنور صاحب نے بھی نظریں اٹھائیں لیکن ان نظروں میں کچھ نہ تھا، خالی اور ویران نظریں وہ انہیں دیکھ کر ہلے تک نہیں۔ بس جس طرح بیٹھے تھے ویسے ہی بیٹھے رہے۔ چھوٹی بیگم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا کر بیڈ تک آئیں اور کنور صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ آداب بیگم صاحبہ۔ آیئے بیٹھیے کنور صاحب نے بڑے نارمل انداز میں کہا جیسے یہ ملاقات چھ ماہ بعد نہ ہوئی ہو چھ گھنٹے بعد ہو رہی ہو۔

کنور صاحب آپ کیسے ہیں؟ چھوٹی بیگم ان کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولیں۔

اب ہمارا کیا پوچھتی ہیں، کنور صاحب نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات شروع کی۔ ہم تو اس دن کو پچھتاتے ہیں جب ہم نے آپ کو پہلی بار دیکھا تھا۔ کاش ہم نے آپ کو نہ دیکھا ہوتا۔

کیا ہوا کنور صاحب؟ چھوٹی بیگم یہ سن کر تڑپ اٹھیں، دل دھک سے رہ گیا۔

جو کچھ ہو چکا ہے اب اس سے زیادہ کیا ہو گا۔

پھر بھی، کچھ بتایئے تو۔

ہم نے آپ کے لئے اپنی بیٹی سعدیہ کو چھوڑ دیا۔ جب سے آپ نے حویلی میں قدم رکھا، اس نے حویلی میں قدم رکھنا خود پر حرام کر لیا۔ شادی کے بعد بس ایک ہی بار وہ بھی آپ کی خواہش پر ہم لاہور ہو گئے تھے اور وہاں جو کچھ ہوا آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ اس کے بعد سے ہم نے کبھی لاہور کا رخ نہیں کیا۔

جی میں جانتی ہوں۔ چھوٹی بیگم نے کہا کیا سعدیہ کی طرف سے کوئی بات ہوئی ہے؟

نہیں اس معصوم بچی کیطرف سے کیا بات ہو گی بھلا وہ ہماری بیٹی ہے، بالکل ہماری طرح انا پرست وہ ہمیں اسی طرح بھول گئی جیسے ہم اس کے باپ ہی نہیں اور ہم بھی شاید اسے اسی طرح بھول گئے تھے۔ کنور صاحب کے لہجے میں بڑا دکھ تھا۔

کنور صاحب! مجھے ایک بار لاہور بھیج دیئے۔ اس مرتبہ میں اسے منا لاؤں گی۔ چھوٹی بیگم نے بڑے یقین سے کہا۔

آپ اس سے کس منہ سے ملنے جائیں گی۔ اگر گئی بھی تو اس مرتبہ وہ آپ کے منہ پر تھوک دے گی۔ کنور صاحب کی آنکھوں میں جیسے بجلیاں سی چمکنے لگیں۔

نہیں ایسا نہیں ہو گا۔

ہاں ایسا کہاں ہو گا بھلا۔ آپ لاہور سعدیہ سے ملنے جائیں گی اور وہاں جا ملیں گی فہد سے۔

فہد کا نام سن کر کوثر کو کرنٹ سا لگا۔ وہ ایک دم پیچھے کو ہو گئی، چہرے پہ زردی پھیل گئی اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ سوچنے لگی یہ فہد کا نام ان کے ذہن میں کہاں سے آیا! اس نے تو اس نام کو اپنے دل کے تہ خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ اس نے تو کبھی سعدیہ کو بھی نہیں بتایا تھا، پھر یہ نام کنور صاحب نے کہاں سے کھینچ لیا کہ وہ بیوقوف یہاں تک آ پہنچا ہے؟ شاید ایسا ہی ہوا ہو گا۔

آپ میرے ملازمین سے میرے بارے میں حلف اٹھواتی ہیں کیا، آپ اس مسئلے پر حلف اٹھانا پسند کریں گی کیا؟ میں جو کرتا ہوں اس سے آپ کی عزت خراب نہیں ہوتی لیکن آپ نے جو کچھ کیا ہے اس سے میری عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی ہے۔ بتایئے اس کی کیا سزا دوں آپکو؟

یہ فہد کا نام آپ کو کس نے بتایا؟

خود فہد نے۔

کیا وہ یہاں آیا تھا؟

آیا تھا نہیں آیا ہوا ہے۔ وہ میری قید میں ہے اور اپنی قسمت کے فیصلے کا منتظر۔ کنور صاحب نے بہت تلخی سے کہا۔

کنور صاحب آپ مجھے جو چاہیں سزا دے لیں لیکن اسے چھوڑ دیجیے۔ کوثر نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

یہ سن کر کنور صاحب کے اندر کئی آتش فشاں پھٹے، وہ بیڈ پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، ان کی آنکھیں لاوا اگل رہی تھیں اور دانت بھینچے ہوئے تھے۔ تب انہوں نے بیٹھے بیٹھے ایک فیصلہ کیا اور اس فیصلے پر فوری عمل درآمد کے لئے گھنٹی بجائی، چند لمحوں کے بعد ایک ملازمہ اندر داخل ہوئی۔ جی سرکار۔

یعقوب!۔

جی بہتر سرکار۔ حکم سن کر وہ الٹے قدموں لوٹ گئی۔

کوثر! میں اپنی زندگی میں ہر طرح کی عورتیں دیکھی ہیں لیکن تجھ جیسی کمینی عورت میں نے آج تک نہیں دیکھی، اب تو نہ صرف خود سزا بھگتے گی بلکہ اپنے یار کو بھی اپنی آنکھوں کے سامنے سزا پاتے دیکھے گی۔

جی سرکار۔ یعقوب نے حاضر ہو کر پوچھا۔

فہد کو یہاں لاؤ اور ایک پیالہ بھی۔

یعقوب نے خاموشی سے اثبات میں گردن ہلائی اور تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

یعقوب کے نکلتے ہی کوثر کنور صاحب کے قدموں میں گر پڑی اور روتے ہوئے بولی "کنور صاحب مجھے معاف کر دیں"۔

کنور صاحب فوراً پیچھے ہٹ گئے اور بہت غصے سے بولے، ذلیل عورت خاموش بیٹھ۔

کوثر نے اتنے غصے میں کنور صاحب کو کبھی نہیں دیکھا تھا، وہ سہم کر پیچھے ہٹی اور بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

یعقوب نے حکم بجا لانے میں بہت مستعدی کا ثبوت دیا، اس نے بلا تاخیر دونوں چیزیں پیش کر دیں۔

فہد کمرے میں داخل ہوا تو اس کی حالت بگڑی ہوئی تھی، چہرے پر کئی زخموں کے نشان تھے، کپڑے پھٹے ہوئے تھے، کیا ہوا اسے؟ کنور صاحب نے پوچھا۔

سرکار، اس نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

اچھا! اسے معلوم نہیں کہ یہ کس کی گرفت میں ہے؟

اسے بتادیا گیا ہے سرکار۔

اسے تو ہم بتائیں گے، پھر وہ یعقوب سے مخاطب ہو کر بولے۔

یعقوب تم ٹھہرو، باقی لوگوں کو باہر بھیج دو۔

یہ حکم سن کر وہ محافظ جو فہد کو گرفت میں لیے ہوئے تھے فوراً باہر چلے گئے۔

دروازہ بند۔۔۔

یعقوب نے حکم کی تعمیل کی، دروازہ بند ہو گیا۔

بیٹھو فہد! ہم نے جب تمہارا ذکر کوثر سے کیا تو اس نے ہم سے تمہاری رہائی کی درخواست کی اور خود سزا بھگتنے کی آرزو۔ اس کی خواہش کے احترام میں ہم نے سوچا کہ تمہیں آزاد کر دیں، دنیا کی ہر فکر سے آزاد۔

فہد نے کوئی جواب نہ دیا اس کے حواس پہلے ہی گم تھے۔ بس اس نے ایک نظر کوثر کو دیکھا اداسی اور بے بسی سے۔

کنور صاحب نے میز سے سرخ مشروب سے بھرا چاندی کا پیالہ اٹھانے کا حکم دیا، پیالہ اٹھاؤ۔

یہ سن کر یعقوب تیزی سے آگے بڑھا۔

نہیں تم نہیں،۔ تم کوثر، یہ حکم میں نے تمہیں دیا ہے۔

اس پیالے میں کیا ہے؟ کوثر نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

زہر۔ بہت سچائی سے بتایا گیا۔

نہیں یہ زہر میں نہیں پلاؤں گی۔

پلانا ہو گا اور پھر خود پینا ہو گا۔ بس یہی نجات کا راستہ ہے۔

کنور صاحب آپ بہت ظالم ہیں۔

میں جو کچھ ہوں خوب جانتا ہوں، آپ کی تشریح کا محتاج نہیں، کوثر بیگم پیالہ اٹھاؤ، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ اگر آپ نے فوراً میرا حکم نہ مانا تو مجھے منوانا بھی آتا ہے اور اس بات سے آپ اچھی طرح واقف ہیں ہوں گی۔

کوثر کیا یہ بات تو اب فہد کو بھی اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ اس کالی حویلی میں جو کہا جاتا تھا وہ کر کے دکھایا بھی جاتا تھا، تب کوثر نے لرزتے ہاتھوں سے وہ چاندی کا پیالہ اٹھایا، جس میں سرخ رنگ کی موت رقصاں تھی۔

کوثر کو ہاتھ میں پیالہ لیے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر فہد کے جسم میں کپکپی طاری ہو گئی۔

وہ نہیں۔ کہہ کر دو قدم پیچھے ہٹا، کنور صاحب نے اشارہ کیا۔ یعقوب نے پستول کی نال اس کی کمر سے لگا دی اور بولا پیچھے نہیں آگے بڑھو، اگر اب تم پیچھے ہٹے تو میں فوراً گولی چلادوں گا۔

موت کو پیچھے رقصاں دیکھ کر وہ فوراً آگے بڑھا۔

کوثر اب اس کے نزدیک آچکی تھی۔اس نے بہت گہری نظروں سے فہد کو دیکھا اور بہت میٹھے لہجے میں بولی، فہد میں تمہارے بغیر ادھوری ہوں مرد بنو! اس زہر کو خوشی سے پی لو اور ان سب کو بتادو کہ تم بھی میرے بغیر ادھورے ہو۔لو اسے پی لو، اس میں تمہاری موت نہیں ہماری زندگی ہے۔

لاؤ میں اسے پی لیتا ہوں اور بتادیتا ہوں کہ موت ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، پلاؤ مجھے۔

کوثر نے آنسو بھری آنکھوں سے فہد کو دیکھا، مسکرائی اور بڑے پیار سے بولی، مجھے تم پر فخر ہے فہد لو، لب وا کرو۔

فہد نے ہونٹ کھولے تو کوثر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہونٹوں سے موت کا جام لگادیا اور وہ غٹ غٹ کر کے موت کو گھونٹ گھونٹ پی گیا۔

پیالہ ختم ہوتے ہی وہ زمین پر گرا اور کسی زخمی پرندے کی طرح تڑپنے لگا۔

کوثر نے پیالہ پھینک کر اس سنبھالنے لئے بڑھی تو کنور صاحب نے زور سے دھکا دے کر اسے بیڈ پر گرادیا اور بولے۔اسے زہر پلایا ہے تو اسے تڑپتا ہوا بھی دیکھ۔

کوئی دس منٹ تک فہد موت وزیست کی کشمکش میں رہا، کوثر سے اس کی یہ حالت دیکھی نہیں گئی وہ بے ہوش ہوگئی، کچھ دیر بعد فہد بھی ٹھنڈا ہوگیا۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد بڑی کوششوں سے کوثر کو ہوش آیا۔اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو فہد اسے قالین پر بڑے سکون انداز میں لیٹا نظر آیا۔

چلو اٹھو۔کنور صاحب نے اسے ٹھوکر لگاتے ہوئے کہا، وہ تو چلا گیا اب تم بھی جاؤ۔۔۔وہ تمہارا انتظار کرتا ہوگا، جس کے بغیر تم ادھوری ہو۔

ہاں سفاک آدمی میں اس کے بغیر ادھوری ہوں۔۔۔میں بھی جاتی ہوں۔میرا اب یہاں کیا ہے، لاؤ دو پیالہ۔

میں نہیں دوں گا، یہ زہر تو تمہیں خود ہی اٹھا کر پینا ہوگا، کنور جہاں زیب نے کہا۔کوثر ہمت کر کے اٹھی، اس نے بڑے عزم سے چاندی کا پیالہ اٹھایا، چند لمحے فہد کی لاش کو دیکھا اور آنکھیں بند کر کے موت کو منہ لگا

.

"بس ابھی آیا ہوں سرکار "یعقوب نے بندھے ہاتھوں کو کھولا۔

"کیا خبر لائے؟

"سرکار! آپ کا اندازہ صحیح تھا وہاں ایک لڑکا پہلے ہی روز جال میں پھنس گیا"یعقوب کے ہونٹوں پر خشکی آنے لگی تھی سچ تو بہر حال بولنا ہی تھا۔

"کون ہے وہ"کنور صاحب نے دینی کتاب ایک طرف میز پر رکھ دی اور آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے بولے۔

"خاموش کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں، کون ہے وہ لڑکا؟"

یعقوب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے بیٹے ایاز کا ذکر کرے، کس منہ سے بتائے کہ وہ اس کا اپنا خون ہے جس نے حویلی کی عزت پر ہاتھ ڈالا۔وہ اپنے خشک ہونٹوں پر بار بار زبان پھیر رہا تھا۔حلق میں کانٹے

چھپ رہے تھے وہ زیادہ دیر خاموش بھی نہیں رہ سکتا تھا اور سچ کو جھوٹ بتانے کی ہمت بھی نہ تھی فوراً ہی کچھ کہنا تھا، کچھ بولنا تھا۔

"سرکار چھوٹی بیگم کو یہاں بلوا کر ان سے پوچھیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔"

"میں نے تمہیں کس لئے بھیجا تھا بولو؟"

"میں اپنا کام کر آیا ہوں سرکار، آپ کے لئے معلومات اکٹھا کر لایا ہوں سرکار، آپ مجھے بے شک گولی مار دیں لیکن اس لڑکے کا نام مجھ سے نہ پوچھیں" یعقوب نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

کنور جہاں زیب کا غصہ تب حیرت میں بدل گیا، "تم اس کا نام بتاتے ہوئے کیوں ڈر رہے ہو؟ کیا تمہاری اس سے کوئی رشتہ داری ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"رشتے دار سی رشتے داری۔۔۔" یعقوب نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا اور پھر وہ کنور صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ "سرکار وہ میرا خون ہے، بدبخت وہ میرا بیٹا ایاز ہے سرکار، آپ اسے معاف کر دیں۔ میں اسے سمجھاں گا۔"

یہ سب کر کنور صاحب کھڑے ہو گئے، ان کے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں، چہرہ سُرخ ہو گیا، لگتا تھا جیسے آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑیں گے لیکن وہ ضبط کر گے منہ سے ایک لفظ نہ بولے اور یعوب ک اپنے قدموں سے ہٹا کر حویلی میں چلے گئے۔ حویلی میں پہنچ کر انہوں نے کسی کو ٹیلی فون کیا اور بڑی دیر تک اسے ہدایات دیتے رہے۔ پھر رسیور رکھ کر کرسی پر نیم دراز ہو گئے ان کی پیشانی پر اب سلوٹیں پڑی تھیں اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ کچھ دیر اسی طرح بیٹھے رہنے کے بعد انہوں نے یعقوب کو بلا لانے کا حکم دیا۔ ملازم حکم سُن کر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد یعقوب نظریں جھکائے کمرے میں داخل ہوا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا "جی سرکار!"

"یعقوب کل تک تمہارے بیٹے کی لاش تم تک پہنچ جائے گی، تم ہمارے پرانے ملازم ہو اس لئے میں نے تمہاری جان بخش دی ہے، ویسے تمہارے بیٹے نے ہمارے ساتھ بت برا کیا، ہم نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی، مگر اس بدبخت نے میں وہیں پہنچا دیا جہاں سے چلے تھے۔ شاید یہ نیکی کے دو چار دن ہمیں راس نہ آ سکے، خیر اب تم جاؤ۔ اس بے وقوف لڑکے کی لاس کا انتظار کرو، اسکی تجہیز و تکفین کا انتظام کرو۔"

ایسی دلخراش بات سُن کر یعقوب کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا اسے در و دیوار گھومتے ہوئے محسوس ہوئے وہ چکرا کر زمین پر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔

کنور صاحب بڑے اطمینان سے کسری سے اٹھے انہوں نے کمرے میں لگی بیل کو دبایا، چند لمحوں بعد ایک ملازم اندر داخل ہوا، "امیر خان کو بلاؤ" کنور صاحب نے حکم دیا۔

امیر خان بھی ان کا ایک پرانا ملازم تھا وہ یعقوب کی طرح اگرچہ کنور صاحب کی ذاتی زندگی سے واقف نہ تھا لیکن اتنا اجنبی بھی نہ تھا۔ اس نے بھی کہاں کنور جہاں زیب کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ امیر خان کمرے میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اسکی نظر یعقوب پر پڑی، اسے اس طرح بے ہوش دیکھ کر وہ اندر ہی اندر بہت خوش ہوا۔

امیر خان! یعقوب کو یہاں سے اٹھاؤ اور اتنا یاد رکھو کہ یہ کسی طرح بھی حویلی سے نکلنے نہ پائے اسے کل شام تک حویلی میں روکنا ہے، سمجھ گئے میری بات؟

"جی سرکار سمجھ گیا" امیر خان یہ کہتے وئے جھکا، اس نے یعقوب کو بڑآسانی سے اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور کمرے میں سے نکل گیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد جب یعقوب کو ہوش آیا تو اس نے خود کو امیر خان کی قید میں پایا۔ وہ ہاتھ میں پستول لئے بیٹھا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

"امیر خان! اس وقت میرے بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے، وہ بے قصور ہے اسے کنور صاحب مار دیں گے، تم مجھے یہاں سے جانے دو۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا"۔ یعقوب گڑگڑایا، رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ مگ امیر خان مسکرائے جا رہا تھا پھر اچانک اسکا چہرہ سنجیدہ ہو گیا اور وہ تیکھے تیکھے لہجے میں بولا۔

"یعقوب تم نے جانے کتنے بے قصور لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جانے کتنی لڑکیوں کو تباہو برباد کر دیا۔ اس وقت تمہیں کچھ خیال نہ آیا؟ اب بیٹے کی زندگی خطرے میں ہے تو کتنے تڑپ رہے ہو، ارے کاموشی سے بیٹھو۔ جو ہونا ہے اسے ہونے دو، آخر بے قصوروں کی آہ کب تک نہ لگے گی۔"

یعقوب کو اچھی طرح اندازہ ہو گا تھا کہ امیر خان سے کوئی درخواست رکنا پتھر سے سع پھوڑنے کے مترادف ہے۔ اس نے جو کچھ زندگی میں کا تھا اب شاید وہ بھگتنے او وقت آگیا تھا لیکن اس نے جو کچھ کیا تھا کنور صاحب کے لئے کیا تھا، اپنے آقا کے حکم پر کیا تھا وہ تو محض کٹھ پتلی تھا اسے تو اشاروں پر ناچنا ہی تھا۔

ادھر امیر خان یعقوب کے سر پر سوار تھا تو ادھر ایاز کے سر پر موت منڈلا رہی تھی۔ صبح جب وہ کالج جانے کے لئے ہوسٹل کے گیٹ سے باہر آیا تو گیٹ کے نزدیک کھڑی ایک گاڑی سے اس پر فائرنگ ہو گئی اور ایک دوسری گاذی اس کے نزدیک آکر رکی اس میں سے چار آدمی نیچے اُترے، انہوں نے ایاز کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور کاڑی گولی کی طرح سنسناتی سڑک پر آگئی۔

اب اس گاڑی کا رخ نور پور کی طرف تھا۔

سہ پہر تک اس گاڑی نے ایاز کی لاش کو اسکے گھر کے آنگن میں اتار دیا تھا اور پھر حویلی کا رخ کیا۔

ایاز کے قتل کی اطاع کنور صاح کو فون پر مل چکی تھی، اب وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہے تھے اور دوسری اطلاع کے منتظر تھے۔ بالآخر گاڑی کے ساتھ ہی دوسری بھی اطلاع آگئی کہ ایاز کی لاش اسکے گھر بحفاظت پہنچادی گئی ہے۔

یہ سُن کر کنور صاحب کے ہونٹوں پر ایک سفاک مسکراہٹ ابھری، اور قلب میں ٹنڈک سی محسوس ہوئی۔ و دو چار دن میں کنور صاحب سے تھڑے بہت انسان بن گئے تھے نماز پڑھنے لگے تھے، شراب چھوڑ سی تھی اور وہ سب بھی چھوڑ دیا تھا۔۔۔۔ جس سے ان کی زندگی عبادت تھی۔ اب وہ سب پھر سے لوٹ آیا تھا، ان کے اندر کی درندگی کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اٹھی تھی اور اب انہیں کچھ نہیں دکھائی دے رہا تھا، سوائے آگ اور خون کے۔

تب انہوں نے ایک ملازم سے امیر خان کو بلانے کا اشارہ کای امیر خان آیا تو انہوں نے یعقوب کو واپس اتھ لانے کا حکم دیا۔ تھوڑی دیر بعد یعقوب سر جھکائے کمرے میں داخل ہوا۔ اور رحم طلب نظروں سے کنور صاحب کو دیکھنے گلا۔ وسوچ رہا تھا کہ ہو سکتا ہے کنور صاحب نے اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کے عوض اپنا فیصلہ بدل دیا ہو۔

"یعقوب ہم نے تم سے کای وعدہ پورا کر دیا ہے، اس بے وقوف لڑکے کی لاش تمہارے گھر کے آنگن میں اتار دی گئی ہے۔ اب تمہیں جانے کی اجازت ے۔ لیکن اتنا یاد رکھنا کہ اس علاقے کی پولیس چوکی میری زمین پر بنی ہوئی ہے۔ میرے بارے میں کسی سے کچھ کہنا اپنی موت کو دعوت دینا ہو گا۔ میرا خیال ہے کہ اس واقعے کع بھول جانا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے، اب تم جا سکتے ہو۔ حویلی کے گیٹ پر تمہیں ایک بریف کیس مل

جائے گا اس میں اچھی خاصی رقم ہے کہ تم ساری زندگی آرام سے گھر بیٹھ کر کھا سکو۔ آج سے حویلی کے دروازے تم پر بند کئے جاتے ہیں۔" کنور صاحب نے یہ کہہ کر امیر خان کو اشارہ کیا" لے جاؤ اسے امیر خان"۔

یعقوب کی عجیب حالت تھی۔ اس کی وفاداری اور خدمت گزاری کا یہ صلہ ملا تھا اس کا اکلوتا بیٹا موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔ اور اس حویلی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے گئے تھے۔ اس میں اسکا کیا قصور تھا، شاید یہ کہ اس نے پوری سچائی سے اپنے بیٹے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اگر نہ بتاتا تو بھی کنور صاحب کو کسی اور کے ذریعے پتہ چل جانا تھا۔ تب شاید وہ اسے بھی زندہ نہ چھوڑتے۔

کنور جہاں زیب کے سامنے وہ کتنا بے بس تھا وہ کنور صاحب جیسے ہاتھی کے سامنے کسی چیونٹی کی طرح تھا لیکن کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔

اپنے بیٹے کی لاش کو قبر میں اتارے ہوئے اس نے قسم کھائی کہ وہ ایاز کی موت کا انتقام لے کر رہے گا۔ چاہے اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ حویلی میں اب یعقوب کی جگہ امیر خان نے لی تھی، کنور صاحب اس محل نما حویلی میں تنہا رہ گئے تھے۔ امیر خان کے فرائض میں کنور صاحب کی تنہائی دور کرنا بھی شامل تھا۔ اور وہ اس فرض کو بخیر وخوبی نباہ رہا تھا۔

کروڑوں کی جاگیر کے مالک کنور جہاں زیب کی زندگی میں سکون نہ تھا، ہر وقت بے چینی اور بے قراری سی رہتی، بعض وقت طبیعت کسی طور پر نہ سنبھلتی، روپے سے اگر سکون خریدا جا سکتا تو وہ دگنے معاوضے پر خرید لیتے لیکن ایسا نہیں تھا کہ بکنے والی جنس۔

ایاز کے قتل کے بعد ان کی کہ بے قراری دوچند ہو گئی تھی۔ ایک طرف انہوں نے ایک باپ سے اسکا بیٹا چھینا تھا تو دوسری طرف اپنی بیٹی سے اسکا محبوب ان کا خیال تھا کہ یعقوب سعدی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا امیر خان نے اس خیال کی تائید کی تھی، لٰہذا فوری طور پر کنور صاحب نے دو مستعد بندے سعدیہ کی چوبیس گھنٹے حفاظت کے لئے معمور کر دیئے تھے اور انہیں یعقوب کی طرف سے بطور خاص چوکنا رہنے کی ہدایت کر دی تھی۔ کنور صاحب کا حکم تھا کہ یعقوب اگر سعدیہ کی کوٹی کے آس پاس کہیں نظر آئے تو فوراً گولی مار دی جائے۔

سعدیہ کو ایاز کے ہوسٹل سے اس کی موت کی اطلاع مل گئی تھی کیونکہ اس واقعے کو کئی لڑکوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا تب سعدی کی سمجھ میں سارا کھیل آ گیا تھا، وہ جان گئی تھی کہ ایاز کو قتل کرنے والا کون ہے ایک بڑا جاگیر دار اپنے ادنی سے ملازم کے بیٹے کو بیڑی کس طرح دے دے آخر۔

سعدیہ نے اس حادثے کو کسی طرح سہہ لیا اور ساتھ ہی یہ بھی طے کر لیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گی، امریکا چلی جائے گی اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

یعقوب پر اگرچہ حویلی کے دروازے بند کر دیئے تھے لیکن اسے اندر جانے سے روکنے والا کوئی نہ تھا، معطل ہو جانے کے باوجود حویلی کے ملازمین کی ہمدردیاں اس کے ساتھ تھیں۔۔۔ ان ملازمین سے وہ ہمیشہ اچھی طرح پیش آیا تھا تقریباً سبھی پر اس کے کچھ نہ کچھ احسانات تھے لٰہذا ایک دن وہلاکت خان سے ملنے کے بہانے حویلی میں داخل ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھاجب رانی کو گوشت کھلانے کے لئے کنور صاحب کے پاس لے جایا جاتا تھارانی پنجرہ گاڑی میں بند تھی،کچھ دیر بعد پنجرہ گاڑی کو حویلی کی طرف دھکیلنا تھااور یعقوب نے اچھی طرح سوچ لیا تھا کہ اس نے کیا کرنا ہے۔

ادھر کنور صاحب بڑے مضبوط قدموں سے چلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے،امیر خان پیچھے پیچھے تھا۔کنور صاحب نے بڑے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے حکم دیا۔

امیر خان بڑادروازہ کھولنے کے لئے تیزی سے بڑھاتب ہی کمرے کے باہر ایک فائر کی آواز سنائی دی،امیر خان نے جلدی سے دروازہ کھولا تو رانی دھاڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔اس کمرے میں داخل ہوتے ہی دروازہ باہر سے بند ہو گیا۔

کنور صاحب گھبرا کر کرسی سے کھڑے ہو گئے وہ ابھی صرف اتنا ہی دیکھ پائے تھے کہ رانی کی ایک آنکھ سے خون بہہ رہا ہے کہ وہ دہاڑتی ہوئی کنور صاحب پر حملہ آور ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کنور صاحب چیر پھاڑ کرر کھ دیا۔امیر خان نے چھوٹے دروازے سے جو حویلی میں کھلتا تھا۔بھاگنے کی کوشش کی لیکن رانی نے اسے پیچھے سے دبوچ لیااور اس کی گردن من میں لے کر ایک جھٹکے سے توڑدی۔امیر خان رشہ جاں سے چھوٹا کنور صاحب پہلے ہی ایک کونے میں ادھڑ پڑے تھے حالت رانی کی بھی اچھی نہ تھی،اس پر گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی تھی،اس پر گولی بہت قریب سے چلائی گئی تھی جو اس کی آنکھ پھوڑتی ہوئی کھوپڑی سے نکل گئی تھی۔وہ اب جھوم رہی تھی جیسے نشے میں ہو وہ کبھی امیر خان کی لاش بھنبھوڑتی تو کبھی کنور صاحب کے جسم کو کھینچنے لگتی تھی قدم کسی طرف اٹھاتی تھی تو پڑتا کسی طرف تھا آخر وہ چکراتی ہوئی زمین پر گری اور وہیں ڈھیر ہو گئی،کمرے مین سناٹا چھا گیا۔

پانچ،دس منٹ مزید گزرنے کے بعد یعقوب نے باہر سے دروازہ کھولا،اس کے ہاتھ میں پستول تھااور اس کانشانہ بڑا سچا تھا۔وہ ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھالیکن اندر کی صورت حال بڑی اطمینان بخش تھی۔کنور صاحب اور امیر خان کی لاشیں ادھڑی پڑی تھیں اور رانی خون میں لت پت بے جان اپنے آقا کے برابر لیٹی تھی۔

تینوں لاشوں کو دیکھ کر یعقوب کے چہرے پر طمانیت آگئی۔اس نے فوراََ ہی باہر سے دروازہ بند کر دیا اور ہلاکت خان کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔یعقوب اس حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔اسے تہ خانے کا راز بھی معلوم تھا۔وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کہاں زیورات،کرنسی،ہیرے،جواہرات اور سونا رکھا ہے۔

اس نے پورے اطمینان سے ایک بریف کیس میں قیمتی اشیاء بھریں۔ایسی اشیا جو وزن میں کم اور قیمت میں زیادہ ہوں،تہ خانے سے نکل کر دونوں نے حویلی سے نکلنے لگے۔

ابھی ان کی جیپ حویلی کے بڑے گیٹ کے نزدیک پہنچی تھی کہ انہوں ن اچانک فائرنگ کی آواز سُنی۔فائرنگ کے ساتھ ہی دونوں محافظوں کو زمین پر تڑپتا پایا۔یعقوب نے جیپ کو فوراََ بریک لگائے اور پستول جیب سے نکال لیا۔

اب فائرنگ کرنے والے سامنے آچکے تھے وہ جیب پر سوار تھے اور تعداد میں چار تھے۔ان کے ہاتھ میں جدید اسلحہ تھا۔ایک پستول ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا پھر بھی یعقوب نے مت نہ ہارتے ہوئے ایک فائر کیا لیکن ہلاکت خان کی کہنی لگنے سے اس کا ہاتھ ہل گیا اور اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔

بس پھر اس کے بعد اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہ ملی۔گولیاں ان پر بارش کی بوندوں کی طرح برسیں وہ دونوں گاڑی میں ہی ڈھیر ہو گئے۔یعقوب نے مرتے مرتے ان چاروں ڈاکوؤں میں سے ایک کو پہچان لیا تھا

اور حیران رہ گیا تھا۔ وہ کوثر یعنی چھوٹی بیگم کا بڑا بھائی محمود تھا۔ محمود نے اسی دن جس دن کوثر کی میت گھر آئی تھی۔ حویلی میں ڈاکا ڈالنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ سب کچھ حویلی کے بار ہی جیپ میں مل گیا جس کی تلاش میں وہ یہاں تک آئے تھے۔ اس نے سارا مال اپنے قبضے میں کیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں سے نکل چلنے کا اشارہ کیا۔

چند لمحوں بعد ہی ان کی جیپ حویلی کو پیچھے چھوڑ گئی۔

آج حویلی کے ملازمین پر بڑی افتاد پڑی تھی۔ پہلے انہیں رانی کے دہاڑنے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ اس کے آدھے گھنٹے کے بعد حویلی کے باہر گولیوں کی تڑتڑ چلنے کی آوازیں آئی تھیں۔ وسب گھبرا کر باہر نکل آئے تھے اور باہر کا نقشہ دیکھ کر حیران رہ گئے تھے، گیٹ پر دو محافظ مردہ پڑے تھے، تو جیپ میں یعقوب اور ہلاکت خان کی لاشیں ان کا منہ چڑا رہی تھیں۔

ابھی وہ ملازمین صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سعدیہ کی گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی اور وہیں رک گئی۔

سعدیہ نے امریکا جانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا وہ اب کنور جہاں زیب سے آخری مرتبہ ملنے آئی تھی۔ انہیں بتانے آئی تھی کہ وہ کیسے باپ ہیں، کیسے انسان ہیں، لوگ انکے بارے میں کیا سوچتے ہیں، کیا کہتے ہیں۔ اللہ کی اس زمین کو انہوں نے اپنی جاگیر دار سمجھ لیا تھا اور اس زمین پر بسنے والوں کو غلام خیال کر لیا ہے۔ فرعون بن گئے ہیں۔ انہوں نے کیا بویا، کیا کاٹ رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں بہت کچھ تھا۔ ایک لاوا تھا جو اس کے ذہن میں پک رہا تھا وہ پھٹ پڑنا چاہتی تھی۔ وہ پھٹ پڑنے کے لئے یہاں آئی تھی۔ لیکن یہاں تو سین ڈراپ ہو چکا تھا۔ اس کے اسٹیج پر آنے سے پہلے ہی پردہ گر گیا تھا۔

تب اس نے امریکا جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا وہ جس سے بھاگ رہی تھی اب وہ خود ہی مفرور ہو گیا تھا۔ کنور جہاں زیب، جو اسکا باپ تھا در اصل وہ ایک برا عہد تھا، برا زمانہ تھا۔ اب یہ برا عہد، یہ برا زمانہ ختم ہو گیا تھا۔

تب سعدیہ نے اپنے لوگوں کو جو اس کے باپ کی نظر میں غلام تھے اکٹھا کر کے یہ نوید سنائی۔

"یہ دور تک پھیلی ہوئی زمین جس پر میرا باپ قابض تھا جسے وہ اپنی کہتا تھا اور اسی نشے میں انسان کو انسان نہ سمجھتا تھا۔ اس پر اکڑ کر چلتا تھا، اب تم لوگوں کی ہے۔ میں اس حویلی میں ایک کالج کھولوں گی، ایک اسپتال قائم کروں گی اور خود بھی حویلی کے ایک کونے میں رہوں گی۔ اب میں کہیں نہیں جاؤں گی، یہیں رہوں گی۔ آپ لوگوں کے ساتھ۔ آپ لوگوں میں۔ اس کے اس اعلان پر دیر تک اور دور تک تالیاں بجتی رہیں۔